تبلیغی تحریک

شخصیات * تعارف * خصوصیات



مولانا وحید الدّین خاں

تبلیغی تحریک

مولانا وحید الدین خاں

مکتبہ الرسالہ نئی دہلی

Tablighi Tahreek
by Maulana Wahiduddin Khan

First published 1986
Reprinted 2014

Goodword Books
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013
Tel. +9111-4182-7083, Mob. +91-8588822672
email: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

Goodword Books, Chennai
324, Triplicane High Road,
Triplicane, Chennai-600005
Tel. +9144-4352-4599
Mob. +91-9790853944, 9600105558
email: chennaigoodword@gmail.com

Goodword Books, Hyderabad
2-48/182, Plot No. 182, Street No. 22
Telecom Nagar Colony, Gachi Bawli, Hyderabad-500032
Mob. 9448651644
email: hyd.goodword@gmail.com

Printed in India

فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کسی راہ کی ذلت کو اٹھائے بغیر اس کی عزّت کو پہونچنا عادۃً ہوتا نہیں۔

(مولانا الیاس صاحب کا ملفوظ)

اللہ رب ہیں، یہ لفظ نہیں بلکہ ایک محنت ہے۔ اگر کہے کہ میں دکان سے پلتا ہوں یا کسی کھیتی یا ملازمت یا سیاست یا حکومت سے پلتا ہوں تو یہ کہنا لفظ نہیں ہے بلکہ ایک محنت ہے۔ اتنا کہنے کے بعد محنت شروع ہو جاتی ہے کہ زمین خریدتا ہے۔ ہل چلاتا ہے۔ غلّہ لاکر بیچتا ہے۔ جانور اور مکان خریدتا ہے۔ غرض اس لفظ کے پیچھے لمبی چوڑی محنت کی زندگی ہے۔ ایسے ہی جب کہا کہ ہمارے رب اللہ ہیں تو بات ختم نہیں ہوئی۔ بلکہ یہاں سے شروع ہوئی کہ جب اللہ پالنے والے ہیں تو غیروں سے پلنے کا یقین نکالو۔ یہ پہلی محنت ہوئی کہ میں زمین و آسمان اور اس کے اندر کی چیزوں سے نہیں پلتا بلکہ اللہ سے پلتا ہوں۔ اس کو محنت کرکے دل کا یقین بناؤ۔

مولانا محمد یوسف صاحب کی تقریر یکم اپریل ۱۹۶۵ سے

ایمان اور اعمالِ نبوت کی ایک سطح تو وہ ہے جس پر ہم ہیں اور ایک سطح وہ ہے جس پر سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔ ہر آدمی اپنی سطح سے چل کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی سطح تک ہاتھ پاؤں مارے۔ جو جتنا محنت کرے گا اتنا پائے گا۔

(مولانا انعام الحسن صاحب کا ملفوظ)

تمہید

زیر نظر کتاب 'تبلیغی تحریک' کا ایک تعارف ہے۔ اس مجموعہ میں راقم الحروف کے جو مضامین شامل کیے گیے ہیں وہ بہت پہلے لکھے گیے تھے۔ متعدد دوستوں کا اصرار تھا کہ ان کو مجموعہ کی صورت میں شائع کیا جائے۔ زیر نظر مجموعہ اسی کی تعمیل ہے۔

ان مضامین کا ابتدائی حوالہ حسب ذیل ہے:

مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ	مطبوعہ ماہنامہ الفرقان	ذی قعدہ	۱۳۸۶ھ
حضرت جیؒ	ماہنامہ الفرقان	ربیع الاول	۱۳۸۶ھ
دو دن نظام الدین میں	ماہنامہ الفرقان	رجب	۱۳۸۶ھ

ان تین کے علاوہ جو مضامین ہیں وہ متفرق طور پر الجمعیتہ ویکلی یا الرسالہ میں شائع ہوئے تھے ان کے علاوہ مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی ایک تقریر بھی شایع کی جا رہی ہے۔ یہ گویا تحریک تبلیغ کا خود رئیس تبلیغ کی زبان سے مستند تعارف ہے۔

تحریکیں عام طور پر دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو نظام کی بنیاد پر اٹھتی ہیں۔ دوسری وہ جو انسان کی بنیاد پر اٹھتی ہیں۔ اوّل الذکر کا نشانہ اجتماع ہوتا ہے، اور ثانی الذکر کا نشانہ فرد۔

تبلیغی تحریک وہ تحریک ہے جس کا نشانہ فرد ہے۔ ایک انسان کو اس کے رب سے جوڑنا، ایک انسان کو آخرت میں کامیاب انجام کے قابل بنانا، یہ اس کا مقصد ہے۔ اس کے سوا جو چیزیں ہیں ان کو وہ انعامِ خداوندی کے خانہ میں ڈالتی ہے نہ کہ براہ راست جدوجہد کے خانہ میں۔

تبلیغی تحریک کیا ہے ، ایک لفظ میں وہ خدا اور انسان کی دریافت ہے ۔ انسان کی روح ایک ایسا قابلِ اعتماد مرکز چاہتی ہے جو اس کے حوصلوں اور تمناؤں کا مرکز ہو ۔ جو اس کے سفرِ حیات کی منزل بن سکے ۔ جس سے وہ سوال کرے اور جواب پائے ۔ جس سے وہ مستقل طور پر اپنے آپ کو وابستہ کر سکے ۔ جو اس کی ہستی کے تمام مطالبات کی تکمیل ہو ۔ اس طرح کے ایک مقام کو پانا ہی روح کے لیے زندگی کا ملنا ہے ۔ اس کے بغیر روح اپنے کو بے جگہ سمجھے گی اور خلا میں معلق پڑی رہے گی ۔

تبلیغی تحریک ، نفسیاتی مفہوم میں ، انسان کی روح کو اس کا مرکز اور مرجع فراہم کرنے کی ایک کوشش ہے ۔ وہ انسان کو خدا سے ملانے کی ایک مہم ہے ۔ تبلیغی تحریک رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی اس تشخیص کی بنیاد پر کھڑی کی گئی ہے کہ ـــــ ہر انسان کے جسم میں ایک عنصر ہے ۔ وہ بگڑتا ہے تو سارا وجود بگڑ جاتا ہے ۔ وہ بنتا ہے تو سارا وجود بن جاتا ہے ۔ یہ عنصر انسان کا قلب ہے ۔ (الاوھی القلب)

تبلیغ کی ساری کوشش یہ ہے کہ وہ انسان کے اس مرکزی عنصر کی اصلاح کرے ۔ یہ اگر ہاتھ آگیا تو گویا کارخانہ کا سوئچ بورڈ ہاتھ آگیا ۔ اور اگر یہ ہاتھ نہیں آیا تو سب کچھ پاکر بھی گویا کچھ نہیں ملا ۔

شخصيات

مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ

۱۹۶۶ء کی سردیوں کا ایک دن تھا۔ میں نارتھ ایسٹرن ریلوے کے ایک اسٹیشن پر اترا۔ کچھ دور آگے چلا تھا کہ سامنے نظر آیا کہ ایک پیدل قافلہ سڑک کو پار کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ قدیم وضع کا لباس، حلیہ سے دینداری اور سادگی نمایاں، بستر اور ضروری سامان کا بنڈل اپنے اوپر لادے ہوئے چلا جا رہا ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق ہے جو اچانک زمین پر اتر آئی ہے۔ شاید مجھے یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ یہ کون لوگ تھے۔ کیونکہ یہ اب عام طور پر لوگوں کے لیے ایک مانوس منظر بن چکا ہے۔ ملک میں کم ہی لوگ ایسے ہوں گے جنہیں کبھی نہ کبھی اس منظر سے سابقہ نہ پڑا ہو۔ اب اس طرح کی شکلیں دیکھ کر ہر شخص خود سمجھ جاتا ہے کہ یہ کن لوگوں کا قافلہ ہے اور کس مقصد کے لیے اِدھر سے اُدھر سفر کر رہا ہے۔

اس طرح کے بے شمار قافلے آج ساری دنیا میں اپنے قدموں کو دین کی راہ میں گرد آلود کر رہے ہیں۔ شاید ۲۴ گھنٹے میں کوئی وقت ایسا نہیں ہوگا جب کہ دین کی یہ نقل و حرکت کہیں نہ کہیں جاری نہ ہو۔ یہ عظیم حرکت جو تبلیغ کے نام سے چل رہی ہے اور جس نے آج لاکھوں انسانوں میں ایک نیا جوش اور نئی ہلچل پیدا کر دی ہے، اس کا آغاز کرنے والا ایک ایسا شخص تھا جو اپنے لاغر جسم، پستہ قد، اور غیر نمایاں شخصیت کے ساتھ لکنت کا بھی شکار تھا۔ اور مشکل سے اپنی کسی بات کو صاف طور پر ادا کر سکتا تھا۔ یہی وہ حیرت انگیز وجود ہے جس کو لوگ مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے جانتے ہیں۔ اور اس نے جو دینی نقل و حرکت پیدا کی، اس کو عام زبان میں "تبلیغی جماعت" کہا جاتا ہے۔ مولانا اگرچہ جسمانی اعتبار سے کمزور اور دبلے آدمی تھے۔ مگر اس کمزور جسم کے اندر ایک انتہائی طاقت ور چیز چھپی ہوئی تھی، اور وہ ہے لوگوں کو دین کی راہ پر ڈالنے کا بے پناہ جذبہ۔ یہی چیز تھی جس نے ایک کمزور شخص سے وہ کام کرا دیا جو طاقتوروں سے نہیں ہو سکتا۔

ابتدائی حالات

انیسویں صدی کے آخر میں اگر کوئی شخص دہلی کی کسی اونچی عمارت پر چڑھے تو اس کو شہر کے باہر جنوبی سمت میں

دور تک پھیلے ہوئے جنگلوں کے درمیان چند بے ترتیب عمارتیں نظر آئیں گی۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں نظام الدین اولیاء کا مزار ہے اور اسی نسبت سے یہ جگہ بستی نظام الدین کے نام سے مشہور ہے۔ یہیں اس وقت ایک بزرگ رہا کرتے تھے جن کا نام مولانا محمد اسماعیل (م ۱۸۹۸ء) تھا۔ ان کا معمول تھا کہ جو مزدور اس ویرانہ میں آنکلتے ان کا بوجھ اتار کر رکھتے اور اپنے ہاتھ سے ڈول کھینچ کر اُن کو پانی پلاتے، پھر دو رکعت نماز شکرانہ ادا کرتے کہ اللہ نے اپنے بندوں کی اس خدمت کی توفیق عطا فرمائی۔

مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلوی انہیں بزرگ کے صاحبزادے تھے۔ جن کی ولادت ۱۳۰۳ھ اور وفات ۱۳۶۳ھ (۱۹۴۴ء) میں ہوئی۔

مولانا محمد الیاس صاحب خاندان ولی اللٰہی سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ وہی خاندان ہے جس کے متعلق اگر یہ کہا جائے تو صحیح ہوگا کہ ہندستان میں آلِ تیمور کی غلط سیاست نے دین اسلام کو جو نقصان پہونچایا تھا اس کے تدارک اور اصلاح کا کام اللہ تعالیٰ نے اسی خاندان کے ذریعے لیا۔ مولانا الیاس صاحب نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جہاں زندگی میں ہماہمی پیدا کرنے کے لیے لوگوں کو فرضی واقعات کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ کئی کئی پشت سے ان کے خاندان اور رشتہ داروں میں علماء اور مجاہدین کی شاندار روایات چلی آرہی تھیں، ان کے گھر کے باہر اور اندر کی مجلسیں سید صاحب اور شاہ عبدالعزیز صاحب کے خاندان کے قصوں سے گرم تھیں۔ ان بزرگوں کے واقعات مردوں اور عورتوں کی زبانوں پر تھے۔ اور گھر کی بیبیاں بچّوں کو طوطا مینا اور پریوں کی کہانیاں سنانے کے بجائے ان کے روح پرور واقعات سناتی تھیں۔ گھر میں ہر طرف نماز، روزہ، تلاوت اور ذکر کا منظر دکھائی دیتا تھا۔ گھر کی کوئی بڑی بی خوش ہوتیں تو یہ نہ کہتیں کہ "میرا بچّہ آئی۔سی۔ایس میں جائے گا۔" بلکہ ان کی زبان سے نکلتا —— "بیٹے مجھے تجھ سے صحابہ کی خوشبو آتی ہے" یہ تھے وہ ابتدائی خاندانی حالات جن میں مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی پرورش ہوئی۔

آپ کے گھر پر ایک تجارتی کتاب خانہ تھا جس کا انتظام آپ کے بڑے بھائی مولانا یحییٰ صاحب کرتے تھے۔ مولانا الیاس صاحب یوں بھی بچپن سے کمزور ہونے کی وجہ سے جسمانی مشقّت کا کام نہ کرسکتے تھے۔ اور وہ اس میں کچھ حصّہ نہیں لیتے تھے۔ ان کا وقت زیادہ تر مطالعہ اور دینی مشاغل میں گزرتا تھا اس کے برعکس بڑے بھائی کافی محنت سے کتاب خانہ کے امور انجام دیتے تھے۔ ایک روز کتاب خانہ کے منتظم نے کہا "مولوی الیاس کتاب خانہ کے کاموں میں کچھ ہاتھ نہیں بٹاتے۔ کوئی خدمت ان کے ذمہ بھی کردینی چاہیئے"۔ بڑے بھائی نے تکدّر کے ساتھ جواب دیا —— "حدیث میں آیا ہے کہ هَلْ تُرْزَقُونَ اِلَّا بِضُعَفَائِكُمْ (تم کو جو رزق ملتا ہے وہ تمہارے کمزور افراد ہی کی برکت تو ہوتی ہے) میرا اعتقاد ہے کہ مجھے اسی بچّہ کی

برکت سے رزق مل رہا ہے۔ اس لیے آئندہ اس قسم کی بات مجھ سے نہ کہی جائے۔"

اخلاص اور دینداری کے اس ماحول کا نتیجہ یہ تھا کہ مولانا کی پرورش اس طرح ہوئی گویا وہ دین کے گھوارے میں پل رہے ہیں۔ ایسی حالت میں جذبات کا دین کی راہ پر مڑ جانا بالکل فطری تھا۔ مولانا کے ایک ہم درس بیان کرتے ہیں کہ بچپن میں جب وہ ان کے ساتھ مکتب میں پڑھتے تھے، ایک دن آپ لکڑی لے آئے اور کہا ـــ "آؤ میاں ریاض الاسلام! چلو بے نمازیوں پر جہاد کریں۔"

مکتب کی تعلیم سے فارغ ہوکر مولانا نے قدیم طرز پر عربی و دینی تعلیم حاصل کی اور اس کے بعد مدرسہ مظاہر العلوم (سہارن پور) میں استاد مقرر ہوئے۔ مگر قدرت کو منظور تھا کہ اب آپ کو اگلے مرحلہ کی تربیت گاہ میں پہونچایا جائے۔ پہلے ذکر آچکا ہے کہ آپ کے والد صاحب دہلی کے پاس بستی نظام الدین میں رہتے تھے۔ وہاں انہوں نے ایک چھوٹا سا مدرسہ جاری کیا تھا۔ جس میں کچھ غریبوں کے بچے پڑھنے آیا کرتے تھے۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد آپ کے بھائی مولانا محمد صاحب نے اس مدرسہ کو سنبھالا۔ ۱۳۲۶ھ میں ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ اس وقت جب آپ اس سلسلہ میں نظام الدین گئے تو وہاں لوگوں نے اصرار کیا کہ اب یہیں قیام کریں اور والد اور بھائی کی جگہ، جو ان کی وفات سے خالی ہوئی ہے، اس کو پُر کریں۔ آپ نے اس درخواست کو منظور کر لیا۔

یہاں سے آپ کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے جب کہ میواتیوں سے تعلق کی وجہ سے آپ کو تبلیغی تحریک چلانے کی طرف توجہ ہوئی۔ تبلیغ کا ابتدائی محرک میواتی مسلمان بنے۔ اس کے بعد یہ کام دوسرے تمام مقامات پر پھیل گیا۔

میواتیوں میں کام

دہلی کے جنوب کا وہ علاقہ جس میں قدیم زمانے سے میو قوم آباد ہے، میوات کہلاتا ہے۔ یہ تقریباً اسی قسم کی ایک قبائلی آبادی تھی جیسا کہ عرب کے قدیم بدّوؤں کے سلسلے میں ہم تاریخ میں پڑھتے ہیں۔ ایک جاہل اور اجڈ قوم جو غالباً حضرت نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خلفاء و متبعین کی کوششوں سے مسلمان ہوگئی تھی۔ مگر عملاً وہ اسلام سے دور تھے۔ بجز اس خیال کے کہ "ہم مسلمان ہیں" اور کوئی اسلامی چیز ان کے اندر باقی نہیں رہی تھی۔ وہ ناہر سنگھ اور بھوپ سنگھ جیسے نام رکھتے، ان کے سروں پر چوٹیاں ہوتیں، ان کے یہاں مورتیاں پوجی جاتیں، وہ ہندوؤں کے تیوہار اور تقریبات مناتے، دیوی دیوتاؤں کے نام پر قربانی چڑھاتے، شب برات میں ان کے یہاں سید سالار مسعود غازی کا جھنڈا اٹھتا تھا۔ مگر وہ بھی ایک بُت تھا جو پوجا جاتا تھا۔ انہیں کلمہ تک یاد نہ تھا۔ حتیٰ کہ نماز کی صورت سے وہ اس

قدر نا آشنا تھے کہ کبھی کوئی مسلمان اتفاق سے ان کے علاقے میں پہونچ گیا اور اس نے نماز پڑھی تو گاؤں کے عورت، مرد، بچے سب اس کے گرد یہ دیکھنے کے لیے جمع ہو جاتے کہ یہ شخص آخر کیا کر رہا ہے۔ اس کے پیٹ میں درد ہے یا اس کو جنون ہو گیا ہے کہ بار بار اٹھتا بیٹھتا اور جھکتا ہے۔ ان کی تہذیب کا یہ عالم تھا کہ عورت مرد اکثر نیم برہنہ گھومتے تھے۔ چوری ڈکیتی اور رہزنی ان کا پیشہ تھا۔ آپس کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ان کے درمیان لمبی لمبی خوں ریز لڑائیاں ہوتی رہتی تھی۔ وہ فطرتاً جفاکش اور بہادر تھے۔ مگر علم اور تربیت کی کمی نے انہیں جنگلی قبائل کی سطح سے آگے نہیں بڑھنے دیا۔ میجر پاؤلٹ، جو انیسویں صدی کے آخر میں ریاست الور کا افسر بندوبست تھا، کے الفاظ میں:

"میو اپنے عادات میں آدھے ہندو ہیں"۔ [1]

دہلی کی مسلمان سلطنت کے ابتدائی دور میں میواتی بہت تکلیف دہ عنصر بن گئے تھے۔ انہوں نے دہلی کے اوپر تاخت و تاراج شروع کر دی تھی۔ ان کے خوف سے راجدھانی کے دروازے سر شام بند ہو جاتے شام کو شہر پناہ سے باہر نکلنے کی کوئی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ غیاث الدین بلبن نے ان کے خلاف ایک زبردست مہم بھیجی جس میں میواتیوں کی بڑی تعداد قتل ہوئی۔ بعد کے حالات بھی بتاتے ہیں کہ انگریزی حکومت کے افسران اور الور اور بھرت پور کی ہمسایہ ریاستیں وہاں امن و امان قائم کرنے میں ناکام رہی تھیں۔

۱۹۲۱ء کے زمانے میں مزید ایک مسئلہ پیدا ہو گیا۔ آریہ مبلغین سیکڑوں کی تعداد میں اٹھ کھڑے ہوئے جن کا مقصد یہ تھا کہ ہندستان کے وہ باشندے جنہوں نے پہلے اپنے آبائی مذہب کو چھوڑ کر اسلام قبول کیا تھا انہیں دوبارہ اپنے مذہب کی طرف واپس لایا جائے۔ ہر طرف ارتداد کی ہوا پھیلنے لگی اور جاہل نومسلم دیہاتی علاقوں میں آریوں کی کامیابی کی خبریں آنے لگیں۔

بستی نظام الدین عین میوات کے دہانے پر واقع تھی۔ اور یہاں کے مدرسہ میں ان کے کچھ بچے پڑھتے تھے۔ اسی کے ساتھ مولانا الیاس صاحب کے والد بزرگوار اور آپ کے بھائی صاحب مرحوم کے تعلق سے کچھ میواتی عقیدت مند بھی ہو گئے تھے۔ وہ آتے جاتے رہتے تھے۔ مولانا الیاس صاحب نے میواتیوں کی افسوس ناک حالت دیکھی تو ان کے اندر اصلاح کا جذبہ پیدا ہوا۔ آپ کے دونوں پیشرو (والد صاحب اور بھائی صاحب) دینی تعلیم کے ذریعہ پہلے سے بھی ان کی اصلاح کی کوشش کر رہے تھے۔ فطری طور پر آپ کا پہلا ذہن اسی طرف گیا کہ اس سلسلے کو جاری رکھنا ان کی اصلاح کا حقیقی

---

(1) *Gazetteer of Alwar*, 1878

ذریعہ ہے۔ آپ نے اس میں اتنا اور اضافہ کیا کہ خود میوات کے اپنے علاقہ میں بھی دینی مکاتب و مدارس قائم کرنے کی تحریک چلائی۔

یہ دوسرا جزء میواتیوں کے لیے سخت مشکل تھا۔ کیونکہ وہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے کہ بچہ کو کھیتی باڑی اور جانوروں کی دیکھ بھال سے ہٹا کر مدرسہ میں بھٹا دیں۔ تاہم آپ نے کوشش جاری رکھی۔ تبلیغ سے لے کر خوشامد تک ہر طریقہ اختیار کیا۔ میواتیوں سے کہا کہ "تم بچے دے دو، معلّمین کی تنخواہ میں لاؤں گا" بالآخر میوات میں سیکڑوں ایسے مکتب قائم ہوگئے جن میں قرآن اور ابتدائی دینی تعلیم ہوتی تھی۔

اس کے بعد ایک واقعہ ہوا جس نے آپ کی کوششوں کے رُخ کو بالکل موڑ دیا۔ ایک بار آپ میوات کے سفر میں تھے۔ ایک مقام پر مولانا کے سامنے بڑی تعریف کے ساتھ ایک نوجوان پیش کیا گیا کہ یہ میوات کے فلاں مکتب سے فارغ ہو کر نکلے ہیں۔ دیکھا تو ڈاڑھی منڈی ہوئی ہے اور چہرہ اور وضع قطع میں کہیں اسلامیت کا کوئی نشان نہیں، یہ واقعہ مکاتب کی عملی ناکامی کی تصویر تھا۔ مکاتب کے نتائج کے بارے میں جو بے اطمینانی آپ کو رہا کرتی تھی۔ وہ اب پوری شدت کے ساتھ اُبھر آئی۔ مکاتب کے قیام سے بلاشبہ یہ فائدہ تھا کہ آہستہ آہستہ لوگوں کے اندر مولانا کی عقیدت بڑھ رہی تھی، اور ایک دوسرا کام جو مولانا وہاں کرنا چاہتے تھے وہ بھی کسی قدر ہو رہا تھا۔ یعنی میواتیوں کے آپس کے لڑائی جھگڑوں کو چکانا اور باہم صلح کرانا۔ اس میں ان کی کامیابی کا یہ عالم تھا کہ میوات کے لوگ کہنے لگے تھے ـــــ "یہ شخص دیکھنے میں تو ایک مشتِ استخواں ہے۔ مگر جس معاملے میں پڑ جاتا ہے، چٹکیوں میں اس کو سلجھا دیتا ہے۔ اور معلوم نہیں کیا بات ہے کہ بڑے بڑے ضدی اس کے کہنے سے فوراً مان جاتے ہیں۔"

مگر اصل مسئلہ میواتیوں کی دینی بیداری کا تھا۔ اور اس معاملے میں مکاتب کی ناکامی اپنی جگہ بدستور باقی تھی۔ غور و فکر کے بعد آپ پر کھلا کہ اصل رکاوٹ یہ ہے کہ موجودہ طریق کار کے تحت ہم یہ کرتے ہیں کہ میواتیوں کو ان کے مشاغل اور ماحول میں رکھ کر انہیں دین کا سبق پڑھانا چاہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم تو انہیں محنت اور عرق ریزی سے دین کی باتیں بتاتے ہیں۔ مگر اس کے چند ہی لمحے بعد جب وہ اپنے گھر اور اپنے ماحول میں پہونچتے ہیں تو وہاں دوسری قسم کی باتیں انہیں گھیر لیتی ہیں اور پھر خود بخود سفیدی پر سیاہی پھر جاتی ہے۔ اس کا واحد حل جو مولانا کو نظر آیا وہ یہ کہ میواتیوں کی جماعت بنا کر انہیں ان کے ماحول سے نکالا جائے۔ اور پھر مسجدوں میں، دینی مدارس میں، بزرگوں کی صحبتوں میں، اور وعظ و تلقین کے ماحول میں رکھ کر انہیں تعلیم دی جائے اور انہیں ایک عرصہ تک ذکر اور نماز اور دعا میں مشغول رکھ کر متاثر کرنے کی

کوشش کی جائے۔ اب انہوں نے اس دوسرے طریقے کے مطابق کام شروع کر دیا۔

اس کام میں ابتداءً پہلے سے بھی زیادہ مشکلیں پیش آئیں۔ جس میواتی کا یہ حال تھا کہ اس کو اپنا بچہ مقامی مدرسہ میں دینا گوارا نہیں ہوتا تھا، وہ خود اپنا وطن چھوڑ کر اور اپنا وقت نکال کر باہر جانے کے لیے کس طرح راضی ہوتا، مگر مولانا کا اخلاص، مسلسل کوشش، دعائیں اور گریہ وزاری نے بالآخر اس کو ایسا رواج دیا کہ سارے میوات میں ایک نئی حرکت پیدا ہو گئی۔

اس سرکش قوم کو مولانا نے کس طرح رام کیا۔ اس کا اندازہ دو واقعات سے ہوگا۔ ایک مرتبہ دورانِ تبلیغ آپ نے ازراہِ محبت ایک شخص کے اوپر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ آگ بگولہ ہو گیا اور کہنے لگا کہ اگر اب کی تم نے ہاتھ لگایا تو میں لٹھ مار دوں گا۔ آپ نے فوراً اس کے پاؤں پکڑ لیے اور فرمایا کہ — "پاؤں کو تو نہیں کہا تھا" اس کے بعد اس کا غصہ کافور ہو گیا اور فوراً نرم پڑ گیا۔ اسی طرح آپ ایک بار ایک میواتی پر تبلیغ کر رہے تھے کہ وہ بگڑ گیا اور آپ کو ایک گھونسہ مار دیا۔ مولانا الیاس صاحب دُبلے کمزور آدمی تھے۔ گھونسہ کی تاب نہ لا کر زمین پر گر پڑے۔ کچھ دیر بعد جب ان کے حواس بجا ہوئے تو وہ گرد جھاڑ کر اٹھے اور میواتی کا دامن پکڑ لیا اور کہا:

"اچھا تم تو اپنا کام کر چکے، اب میری سنو"

یہ دیکھ کر میواتی آپ کے قدموں پر گر پڑا اور بولا۔ "مولوی مجھے معاف کر ورنہ میری بخشش نہیں ہوگی۔"

اسی اخلاص اور اخلاق کا نتیجہ تھا کہ بالآخر لوگوں کے دل کھنچے۔ میواتیوں کی کثیر تعداد آپ کے ساتھ ہو گئی۔ ان کے قافلے جوق درجوق اپنے علاقوں سے نکل کر نظام الدین، سہارن پور، اور دوسرے مقامات کو جانے لگے اور ہفتوں اور مہینوں تک ان کی زندگیاں دینی تعلیم و تربیت کے سائے میں گزرنے لگیں۔ نتیجہ نے بتایا کہ مولانا کا سوچنا صحیح تھا۔ اس کورس سے نکل کر جو لوگ میوات لوٹتے وہ بڑی حد تک بدل چکے ہوتے۔ ماحول سے متاثر ہونے کے بجائے ماحول کو بدلنے کا جذبہ ان کے اندر بیدار ہو چکا ہوتا تھا۔

اب میوات کی فضا بدلنے لگی۔ پورے علاقے میں دین کی رغبت پیدا ہو گئی۔ جہاں میلوں تک کوئی مسجد نظر نہیں آتی تھی وہاں گاؤں گاؤں مسجدیں بن گئیں۔ مکاتب و مدارس نہ صرف تعداد میں بڑھے بلکہ اب انہیں واقعی میوؤں کے درمیان دینی تعلیم و تربیت کے ادارے کا مقام حاصل ہو گیا۔ غیر اسلامی وضع ولباس کی جگہ اسلامی وضع ولباس ہر طرف نظر آنے لگا۔ ہاتھوں کے کڑے اور کانوں کی مُرکیاں

اترنے لگیں۔ بے کھے لوگوں نے ڈاڑھیاں رکھنی شروع کردیں۔ تقریبات سے مشرکانہ رسوم کا خاتمہ ہوگیا۔ سود خواری کم ہوگئی۔ شراب نوشی کا وجود مٹ گیا۔ قتل و غارت گری اور لوٹ کھسوٹ کی واردات میں کمی آگئی۔ گاؤں کے گاؤں ایسے ہوگئے جہاں ایک بچہ بھی بے نمازی نہیں تھا ان کی معاشرت، ان کے برتاؤ، ان کے لین دین، غرض ہر چیز میں فرق آگیا۔ یہی نہیں بلکہ وہ قوم جو پہلے دینی شعور سے بالکل بیگانہ تھی۔ اس کے اندر یہ جذبہ پیدا ہوگیا کہ وہ دوسروں کو خدا کے دین سے آگاہ کرے۔ ان کی سیدھی سادی زبانوں سے دین کی باتیں سُن کر ایسا محسوس ہونے لگا کہ تاریخ اپنے اوراق الٹ رہی ہے۔ اور آغاز اسلام میں عرب کے نومسلم بدو دوبارہ پیدا ہوکر زمین کے اوپر چلنے پھرنے لگے ہیں۔ اسی زمانے کا واقعہ ہے کہ ایک بزرگ ستمبر ۱۹۲۹ء میں میوات کے حالات کا مشاہدہ کرنے کے لیے گئے ہوئے تھے انہوں نے ایک جاہل میواتی کو روک کر پوچھا ـــــ "یہ تبلیغی دورے تم کس لیے کر رہے ہو" اس نے جواب دیا:

"ہم جہالت میں پڑے ہوئے تھے۔ نہ ہم کو خدا کی خبر تھی نہ رسول کی۔ اس مولوی کا خدا بھلا کرے کہ اس نے ہمیں سیدھا راستہ دکھایا۔ اب ہم چاہتے ہیں کہ اپنے دوسرے بھائیوں تک بھی یہ نعمت پہونچائیں جو ہمیں ملی ہے۔"

میواتی کے یہ سیدھے سادے الفاظ سن کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تاریخ اپنے آپ کو دُہرا رہی ہو۔

مولانا کی شخصیت

کسی کام کی کامیابی کے لیے طریق کار کی صحت کے ساتھ کارکنوں کا اخلاص اور تعلق بھی ضروری ہے۔ یہ مولانا الیاس صاحب کی بے تاب طبیعت نے فراہم کردیا۔ مولانا کو جن لوگوں نے دیکھا ہے ان کی متفقہ شہادت ہے کہ وہ اس قدر بے چین اور مضطرب آدمی تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہ گوشت پوست کا مجسمہ نہیں بلکہ درد اور تڑپ کا مجسمہ ہیں۔ مولانا کے ایک قدیم رفیق ایک بار نظام الدین گئے۔ اس وقت مولانا الیاس صاحب کا انتقال ہوچکا تھا۔ انہوں نے گھر میں مولانا الیاس صاحب کی زوجۂ محترمہ کے یہاں کہلایا کہ مولانا کی کوئی خاص بات جو آپ کو یاد ہو بتائیے۔ محترمہ نے اندر سے کہلایا:

"جب میری شادی ہوئی اور میں رخصت ہوکر مولانا کے گھر گئی تو میں نے دیکھا کہ مولانا راتوں کو بہت کم سوتے ہیں۔ ان کی راتیں بستر پر کروٹ بدلنے اور آہ بھرنے میں گزرتی تھیں۔ میں نے کہا کہ یہ کیا بات ہے کہ آپ کو راتوں کو نیند نہیں آتی۔ مولانا نے ایک آہ بھری اور فرمایا ـــــ کیا بتاؤں اگر تم کو وہ بات معلوم ہوجائے تو جاگنے والا ایک نہ رہے، دو ہوجائیں۔"

مولانا کی ساری زندگی گواہی دیتی ہے کہ وہ سراپا دردِ دین تھے۔ وہ اگرچہ لکنت کی وجہ سے، نیز اکثر قدیم طرز کی زبان اور اصطلاحات میں بولنے کی وجہ سے عام لوگوں کو اپنی بات بخوبی سمجھا نہیں پاتے تھے۔ مگر جب وہ بولتے تو شدت احساس کی وجہ سے ان کا وجود مجسم بیان اور اظہار بن جاتا۔ اکثر ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتے، آہیں بھرتے اور فرماتے ــ "میرے اللہ میں کیا کروں، کچھ ہوتا ہی نہیں" اس قدر کمزور اور لاغر تھے کہ دیکھنے والوں کو ترس آتا۔ مگر اس کے باوجود تندرست اور طاقتور لوگوں سے زیادہ کام کرتے. فرمایا کرتے تھے ــ" دین کے فروغ کے لیے جان دینے کے شوق کو زندہ کرنا اور جان کو بے قیمت کر دینا ہماری تحریک کا خلاصہ ہے۔"

اپنے مقصد کے پیچھے آرام اور کھانا پینا تک بھول جاتے۔ میوات کے ناہموار علاقوں میں ۲۰-۲۰ میل اور ۲۵-۲۵ میل تک پیدل چلے جاتے. کھانا موجود ہونے کے باوجود بعض اوقات اس ہنگامی زندگی کی وجہ سے کھانے کی نوبت نہ آتی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ جمعہ کے دن نظام الدین سے کھانا کھا کر روانہ ہوئے اور اتوار کو نظام الدین واپس آکر کھانا کھایا۔ راتوں کو جاگنا، پہاڑیاں عبور کرنا، میوات کے میدانوں میں کبھی گرم لُو کی لپٹیں اور کبھی زمستانی ہوا کے سرد جھونکوں کا مقابلہ کرنا، یہ ان کی زندگی تھی۔ اس طرح کے پُرمشقت سفروں میں کبھی دیکھتے کہ ساتھی گھبرا گئے ہیں تو فرماتے :

"جبل جُہد کے پرلی طرف خدا ہے جس کا جی چاہے مل لے۔"

بیماری کے عالم میں کوئی خیریت پوچھتا تو فرماتے :

"بھئی تندرستی بیماری تو انسان کے ساتھ لگی ہوئی ہے اس میں کیا خیریت اور کیا بے خیریت۔ خیریت تو جب ہے کہ جس کام کے لیے پیدا کئے گئے ہیں وہ کام ہو۔"

ایک مرتبہ مولانا کے وطن کاندھلہ سے کچھ اعزہ عیادت کے لیے آئے۔ مولانا نے پوچھا کس لیے آئے کہنے لگے آپ کی خیریت دریافت کرنے کے لیے۔ فرمایا ــ" جو مٹنے کے لیے بنا ہے اس کی خیریت پوچھنے کے لیے کاندھلہ سے یہاں تک آؤ۔ اور رسول کریم کا دین جو مٹنے والا نہیں، وہ مٹایا جا رہا ہے، اور تم اس کی خبر نہیں لیتے۔" بیماری میں ڈاکٹر بولنے سے منع کرتے تو فرماتے ــ"تبلیغ کے لیے بول کر مرجانا پسند کرتا ہوں۔ بہ نسبت اس کے کہ اس سے خاموش رہ کر صحت حاصل کر دوں۔" ایک صاحب کو طلب خیریت کے سلسلے میں جواب دیتے ہوئے خط میں لکھا :

"طبیعت میں سوائے تبلیغی درد کے اور خیریت ہے۔"

مولانا کو تبلیغ کے کام سے اس قدر تعلق تھا کہ جب دیکھتے کہ ان کی ساری کوشش کے بعد جو

لوگ ان کے گرد جمع ہوئے ہیں وہ زیادہ تر جاہل یا معمولی پڑھے لکھے لوگ ہیں تو سخت غم گین ہوتے۔ آخری بیماری میں ایک مرتبہ گہرے تاثر کے ساتھ فرمایا:

"کاش علمار اس کام کو سنبھال لیتے اور پھر ہم چلے جاتے۔"

لوگوں کے ساتھ رعایت کا یہ عالم تھا کہ ریل کے سفر میں ایک بار مغرب کے نوافل پڑھتے وقت ایک رفیق نے مسافروں کو سامنے سے گزرنے سے روکنے کا انتظام کیا۔ آپ نے منع فرمایا اور کہا کہ یہ حقوق عامہ ہیں، تم دوسرے کو گزرنے سے نہ روکو بلکہ سُترہ کا انتظام کرو۔ کاندھلہ کے سفر میں ایک مرتبہ بھیڑ کی وجہ سے آپ سکنڈ کلاس میں بیٹھ گئے۔ ٹکٹ تھرڈ کلاس کا تھا۔ خیال ہوا کہ ٹکٹ چک کرنے والا آئے گا تو ٹکٹ بنوا لیا جائے گا۔ وہ آیا تو اس نے ایسی بے ڈھنگی گفتگو کی کہ مولانا کو غصہ آگیا۔ اور اس کو ڈانٹ دیا۔ ٹکٹ بنانے کے بعد وہ چلا گیا۔ تو مولانا انعام الحسن صاحب نے جو اس وقت ساتھ تھے کہا کہ حضرت، اس کو تو کہنے کا حق تھا۔ ان لصاحب الحق مقالاً (جس کا حق آتا ہو وہ کہنے سننے کا مجاز ہے) مولانا نے فوراً اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا اور اگلے اسٹیشن پر اتر کر اس ٹی ٹی ای سے معذرت کی اور معافی مانگی۔

اسی کے ساتھ خدا سے تعلق اور آخرت کے استحضار کا یہ عالم تھا کہ نمازیں انہیں لذت ملتی۔ پہاڑی پر چڑھتے اور اوپر پہونچ کر جب تمام ساتھی تھک کر بیٹھ جاتے، مولانا فوراً نماز کی نیت باندھ کر کھڑے ہو جاتے۔ انتقال کے بعد جب غسل دیا گیا اور خوشبو لگائی جانے لگی تو ایک رفیقِ خاص کی زبان سے بے اختیار نکلا — "پیشانی پر اچھی طرح خوشبو لگاؤ، یہ گھنٹوں سجدہ میں ٹکی رہتی تھی۔"

آپ کی یہی عبادتیں، قربانیاں، اور خلق اللہ سے آپ کی محبت تھی جس نے آپ کی محنت اور آپ کے کام میں وہ تاثیر پیدا کر دی کہ آج جو لوگ تبلیغ کے کام کے پھیلاؤ اور اس کے حیرت انگیز نتائج کو دیکھتے ہیں، ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ مادی اصطلاحوں میں ان واقعات کی کس طرح تشریح کریں۔

ایک مکتوب میں مولانا نے لکھا:

"عاداتِ خداوندی عموماً دین میں اپنی جدوجہد کی مقدار کے ساتھ وابستہ ہیں۔ آدمی کسی مقصد کے لیے جتنا اپنے آپ کو ذلیل کرتا ہے اور تکالیف کو جھیلنے کے ذریعہ اپنے حالات، جوارح، قلب اور قوتوں کی شکستگی اور تعب و انکسار کو پہونچتا ہے، اتنا ہی حق تعالیٰ کی رحمت کے نزول کا سبب ہوتا ہے۔ انا عند المنکسرۃ قلوبھم۔ کسی راہ کی ذلت کو اٹھائے بغیر اس کی عزت کو پہونچنا عادۃً ہوتا نہیں۔"

یہ الفاظ درحقیقت خود کہنے والے کی تصویر ہیں۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ آپ نے خود کو دین کی راہ میں

گھلا دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی زندگی اور آپ کے کلام میں عجیب کشش پیدا ہوگئی۔ مولانا نے جو بات اوپر کے اقتباس میں کہی ہے اس کو دوسرے الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ آدمی جب کسی کام میں اپنے کو فنا کئے ہوئے ہو، اس وقت اس کی شخصیت بے پناہ ہو جاتی ہے۔ اس کی زبان سے تیر و نشتر کی باتیں نکلنے لگتی ہیں جو دلوں میں گھستی ہیں اور روحوں کو بے چین کر دیتی ہیں۔ دلوں کو چھیدنے والے کلمات اسی کی زبان سے نکل سکتے ہیں جس کا دل مقصد کے غم میں چھلنی ہو گیا ہو۔

مولانا کے چند کلمات سے اس کی مزید وضاحت ہو سکے گی۔ ایک مرتبہ آپ نے ایک صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا:

"سمجھے مولوی جی، یہ کام قرن اول کا ہیرا ہے۔ اس کے لیے اپنی جانیں قربان کر دو اور اپنا سب کچھ مٹا دو۔ اس کے لیے جتنا زیادہ قربان کرو گے اتنا زیادہ پاؤ گے۔"

کچھ لوگ مولانا سے ملنے گئے اور مہمان کی طرح رہ کر واپس چلے گئے۔ ان کو کہلایا۔ "تم لوگ آئے اور چند روز مسند نشینی کر کے چل دیے۔ یاد رکھو اس راہ میں بھوک اور پیاس کی تکلیفات برداشت کرنے کی ضرورت ہے۔ اس راہ میں اپنا پسینہ بہاؤ اور خون بہانے کے لیے تیار رہو۔"

ایک خط میں اس پر افسوس کرتے ہوئے کہ فی گھر ایک آدمی بھی لوگ تبلیغ کے لیے نہیں دے رہے ہیں لکھتے ہیں:

"عیسیٰ! تم غور تو کرو۔ دنیا فانی میں کام کے لیے تو گھر کے سارے افراد ہوں اور اس کے لیے صرف ایک آدمی کو کہا جائے اور اس پر بھی نباہ نہ ہو، تو آخرت کو دنیا سے گھٹایا یا نہیں گھٹایا۔"

ایک مرتبہ لکھنؤ میں تبلیغی جلسہ ہوا۔ جلسہ کے بعد تحریک ہوئی کہ کچھ لوگ جماعت بنا کر کانپور کے لیے جائیں۔ مگر اعلان کے باوجود کوئی نام نہیں دے رہا تھا۔ مولانا بے قرار ہو کر کھڑے ہو گئے اور لوگوں کو آمادہ کرنا شروع کر دیا۔ حاجی ولی محمد صاحب کئی روز سے صاحب فراش تھے۔ بواسیر کی شکایت نے نقاہت پیدا کر دی تھی۔ آپ نے ان کی طرف متوجہ ہو کر فرمایا، تم کیوں نہیں جاتے۔ انہوں نے جواب دیا۔ "میں تو مر رہا ہوں"۔ فرمایا "مرنا ہی ہے تو کانپور جا کر مرو"

یہ چند جملے محض سمجھنے کے لیے نقل کر دیئے گئے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کے الفاظ کبھی بھی اپنی اصل حیثیت کے ترجمان نہیں ہوتے۔ کیونکہ جب اس طرح کا جملہ کہا جاتا ہے تو وہ کاغذ پر لکھ کر کسی کو نہیں دیا جاتا، بلکہ کہنے والا سامنے موجود ہوتا ہے اور سننے والا براہ راست اس کے کلمات کو سن رہا ہوتا ہے۔

ایسی حالت میں بات بالکل دوسری ہوجاتی ہے۔ اس وقت یہ الفاظ محض الفاظ نہیں ہوتے بلکہ اس میں دو اور چیزیں شامل ہوجاتی ہیں۔ اور وہ ہیں ــــ جذبات اور شخصیت۔ اس وقت وہ ایک ایسی حقیقت ہوتی ہے جس میں درد، خیر خواہی اور اخلاص کے ساتھ ایک زندہ شخصیت کا پورا وزن بھی شامل رہتا ہے۔ ایسے کلمات جب وجود میں آتے ہیں تو فضا میں رعشہ پیدا کر دیتے ہیں وہ سوتوں کو بیدار کر دیتے ہیں۔ کٹر سے کٹر طبیعتیں رام ہوجاتی ہیں۔ غفلت میں پڑے ہوئے چونک اٹھتے ہیں، فطرت میں چھپی ہوئی عبودیت اس طرح جاگ اٹھتی ہے کہ ساری زندگی کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ ایسے ہی کلمات کے لیے کہا گیا ہے ـــ از دل خیزد بر دل ریزد۔

ایک صاحب ایک مرتبہ تبلیغی جلسہ سے واپس آئے تو مولانا نے فرمایا۔ کہو کچھ اپنی حالت پر افسوس بھی ہوا۔ انہوں نے کہا۔ "جو کچھ دیکھا اس کے بعد تو اپنے کو مسلمان کہتے ہوئے بھی شرم آنے لگی ہے" اسی کا نتیجہ تھا کہ آپ کی زندگی ہی میں کام اس ترقی کو پہونچ گیا کہ نومبر ۱۹۴۱ء میں جب میوات میں پہلا بڑا تبلیغی جلسہ ہوا تو ۲۵ ہزار آدمی اس میں شریک ہوئے۔ ان میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو ۵۰ - ۵۰ میل سے پیدل چل کر وہاں پہونچے تھے۔ ایک میواتی سے جب پہلی بار آپ نے کہا کہ جاؤ تبلیغ کرو۔ تو وہ بولا۔ "تبلید کیا ہو ہے" مگر یہی لوگ جو تبلیغ کا صحیح تلفظ بھی نہیں جانتے تھے وہ ایسے مبلّغ بنے کہ انہوں نے مبلّغوں کی ایک نئی قوم ملک میں پیدا کر دی۔ اگر کوئی اس وقت مبلّغوں کے ان قافلوں کو دیکھے جو بستی بستی اس طرح گھوم رہے ہیں کہ کاندھوں پر کمبل پڑے ہوئے ہیں۔ بغل میں سیپارے دبے ہوئے ہیں۔ چادر کے پلّو میں چنے یا چند روٹیاں بندھی ہوئی ہیں۔ زبانیں تسبیح اور ذکر میں مشغول ہیں۔ آنکھوں میں شب بیداری کے آثار، پیشانی پر سجدے کے نشانات، ہاتھ پاؤں سے جفاکشی اور مشقت نمایاں، تو دیکھنے والوں کو وہ منظر یاد آجاتا جب عرب کے مفلس اور غیر تعلیم یافتہ باشندے اسلام کی دولت کو پاکر سرشار تھے اور قرآن اور احکام دین کی تعلیم کے لیے چاروں طرف چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔

تبلیغ کی اندرونی طاقت

مولانا نے اپنی تبلیغ کے ذریعہ لوگوں کو وہ کیا چیز دی تھی جس نے اتنی بڑی تبدیلی پیدا کر دی۔ وہ تھا آخرت کا خیال اور نصرت الٰہی کا یقین۔ مولانا نے اس حقیقت کو شدت سے لوگوں کے ذہن نشین کیا کہ اس کائنات کا ایک مالک ہے۔ اور اسی کے پاس لوٹ کر ہمیں جانا ہے۔ کائنات کا کوئی ذرہ اس کی مرضی کے بغیر ہل نہیں سکتا جو کچھ ہوگا اسی کے کیے سے ہوگا۔ اس کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔

اس بات کو سمجھنے کے لیے ایک واقعہ پر غور کیجئے۔ مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ایک میواتی

صحبت یافتہ سے ایک شخص نے پوچھا۔" اپنی تبلیغی زندگی کا کوئی واقعہ بتائیے "۔

میواتی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہنا شروع کیا۔" مولانا نے ایک مرتبہ تین آدمیوں کی ایک جماعت مراد آباد بھیجی۔ جس میں سے ایک میں تھا۔ مولانا نے چلتے وقت یہ مختصر سی ہدایت دی کہ اللہ کے نام پر روانہ ہو جاؤ۔ اور جب کوئی مشکل پڑے تو ایسا کرنا کہ بستی کے باہر جاکر تنہائیوں میں نماز پڑھنا اور دعا کرنا کہ خدایا ہماری مشکل حل کر دے۔ ہم لوگ بستی میں پہونچ کر ایک مسجد میں داخل ہوئے۔ مغرب کی نماز کے بعد اعلان کیا گیا " لوگ ٹھہر جائیں۔ کچھ دین کی باتیں ہوں گی " مگر جب ہم سنتوں سے فارغ ہوئے تو دیکھا کہ ایک ایک شخص جاچکا ہے۔ اور مسجد میں ہم تین کے سوا کوئی موجود نہیں۔ اب ہم ٹھیر کر اگلی شام کا انتظار کرنے لگے۔ دوسرے دن پھر مغرب کی نماز کے بعد یہی اعلان کیا۔ مگر دوسرے دن بھی یہی قصہ پیش آیا کہ نماز کے بعد سارے لوگ مسجد سے اٹھ اٹھ کر چلے گئے۔ اب ہمیں مولانا کی نصیحت یاد آئی۔ رات گزار کر صبح کو ہم لوگ حسب ہدایت بستی کے باہر چلے گئے اور سارا دن دعا کرتے رہے۔ شام کو آکر پھر اسی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھی اور جس طرح دو دن اعلان کر چکے تھے، اسی طرح آج بھی اعلان کیا ــــ" نماز سے فارغ ہو کر آپ لوگ ٹھہر جائیں کچھ دین کی باتیں ہوں گی "۔

اتنا کہہ کر میواتی رک گیا۔ وہ پوچھنے والے کو ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے وہ کسی نہایت اہم واقعہ کا انکشاف کرنے جا رہا ہو۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے اپنی خاص زبان میں کہا :

" جیسے دھرتی نے سب کو پکڑ لیا، ایک بھی نہ اٹھا، حضرت! یہ کام تو بس یوں ہی چلے گا "۔

جن لوگوں کو یہ تجربہ ہوا، اس تجربے نے انہیں کتنی قیمتی چیز عطا کی۔ اس نے انہیں اس لازوال حقیقت کا رازداں بنایا کہ یہاں ایک ایسا خزانہ بھی پوشیدہ ہے جس کا مالک بننے کے لیے ٹوٹے ہوئے دل اور بہتے ہوئے آنسوؤں کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت نہیں۔ یہ ایسی طاقت ہے جو زمین کو ہلا دے اور پہاڑوں کو کھسکا دے۔ یہ نہتوں کو عظیم ترین ہتھیاروں سے مسلح کرتا ہے، یہ بے علم افراد کو بڑے بڑے مدعیانِ علم سے مقابلہ کرنے کی ہمت عطا کرتا ہے۔ یہ وہ فیض ہے جس کو پا کر گونگے بولنے لگتے ہیں، اندھے دیکھنے لگتے ہیں اور لنگڑے چلنے لگتے ہیں۔ یہ ہر تالے کی کنجی ہے اور ہر دروازے کو کھولنے والا ہے۔ اس کے ملنے سے وہ سروسامان ملتا ہے کہ انتہائی بے سروسامانی کے باوجود آدمی زندگی کے تمام مراحل کو پار کرتا چلا جائے۔

اس طرح کے بے شمار تجربے ہیں جن سے تبلیغ کی تاریخ بھری ہوئی ہے اور اس نے تبلیغ کے افراد کو ایک ایسی ذہنی اور نفسیاتی طاقت دی ہے کہ وہ انتہائی مشکل حالات کے باوجود اقدام کرنے سے نہیں ہچکچاتے سخت ترین ماحول میں گھس کر کام کرنے سے ہراساں نہیں ہوتے۔ وہ دعا کو اپنے لیے عصائے موسیٰ سمجھتے ہیں۔

انہیں یقین ہے کہ یہ عصا انہیں کسی بھی مقام پر دھوکا نہیں دے سکتا۔

ہر شخص اور ہر قوم کو کسی ایسے سہارے کی ضرورت ہے جس کے اوپر وہ اپنے اقدام اور استحکام کے لیے بھروسہ کر سکے اور جس کے اوپر اپنی زندگی کی تعمیر کرے۔ تمام لوگ ایسا سہارا فراہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اس کے جس سرچشمے سے عام طور پر لوگ واقف ہیں وہ صرف مادی سازوسامان ہے۔ لوگ صرف اتنا ہی جانتے ہیں کہ جدید ترین ٹکنالوجی کو استعمال کر کے بڑے بڑے کارخانے کھڑے کرو۔ بنکوں اور انشورنس کمپنیوں کے ذریعہ سارے ملک کی دولت اکٹھا کرلو۔ بموں اور ہوائی جہازوں سے اپنی فوجی چھاؤنیوں کو بھر دو۔ جبری فوجی ٹریننگ کے ذریعہ سارے ملک کو عظیم فوج میں تبدیل کر دو۔ خلائی سائنس کے محیر العقول کارنامے دکھا کر دنیا کے اوپر اپنا سکہ جما دو، ریڈیو، ٹیلی ویژن، پریس، اور ان تمام چیزوں کے مالک بن جاؤ جن کو آج طاقت و قوت سمجھا جاتا ہے۔

گویا جن لوگوں کے پاس اس قسم کے سازوسامان فراہم کرنے کے حالات نہ ہوں، ان کے لیے اس دنیا میں کچھ نہیں ہے۔ مگر تبلیغی نظریہ آدمی کو طاقت کے ایسے خزانے سے آشنا کرتا ہے جس کے لیے ان میں سے کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ بلکہ صرف ایک ایسی چیز کی ضرورت ہے۔ جو ہر آدمی کے پاس موجود رہتی ہے، خواہ وہ کسی حال میں ہو۔ اور وہ ہے آدمی کا دل۔ اگر آدمی اپنے دل کو خدا کے آگے ڈال دے تو ساری کائنات اس کے قدموں کے نیچے آجائے گی۔

یہ طاقت کا ایک ایسا ذریعہ ہے جس کو اقتصادی امداد روک کر ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ناکہ بندی کر کے اسے مسدود کیا جا سکتا ہے۔ حتیٰ کہ ٹینکوں کا مارچ اور ہوائی جہازوں کی بمباری بھی اسے فنا نہیں کر سکتی۔ اور نہ اس قسم کی کوئی خبر اس کے لیے اندیشہ ناک ثابت ہو سکتی ہے کہ حریف نے زیادہ طاقتور قسم کا ہتھیار ایجاد کر لیا ہے۔

جو نظریہ آدمی کو اتنی بڑی طاقت دیتا ہو، جو نہتوں کو سب سے زیادہ طاقت ور فوج میں تبدیل کر دینے والا ہو، اس کی کشور کشائی اور جہانگیری کا کیا ٹھکانا۔ اور تبلیغی کارکنوں کے وہ حیرت انگیز واقعات جو مغرب سے لے کر مشرق تک پیش آرہے ہیں ثابت کرتے ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے اس سرچشمہ میں سے ایک حصہ عطا فرمایا ہے۔ مگر خدا کی یہ نعمت اپنی پوری شکل میں اس وقت ظاہر ہوگی جب پوری قوم اس راہ پر آجائے۔ مولانا الیاس صاحبؒ کو اس میں ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ اگر پوری قوم اس راہ پر آجائے تو خدا کی نصرت ان کے اوپر اس آخری اور انتہائی شکل میں ظاہر ہو سکتی ہے جب ایک بے حیثیت قوم اٹھ کر پوری دنیا کو زیر و زبر کر دے۔ جب کسی تار کے بغیر ان کے امیر کی آواز مدینہ سے نہاوند کی پہاڑیوں تک سنائی

دے۔ جب سمندروں اور جنگلوں پر ان کا حکم چلنے لگے۔ جب قومیں ان کی باج گزار ہوں اور زمین میں ہر طرف ان کا جھنڈا لہرانے لگے۔ یہ سب ممکن ہے اور اس امکان کا سرا صرف اس واقعہ میں ہے کہ ہم ــ" اللہ کو اپنالیں"۔

نصرت قرآن میں

یہاں "نصرت" کے بارے میں قرآن کا نظریہ بیان کرنا مناسب ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی نصرت جو بندوں کو حاصل ہوتی ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک وہ جس کو قرآن میں "حیات طیبہ" کہا گیا ہے اور دوسری وہ جس کے لیے استخلاف اور تمکین فی الارض کے الفاظ آئے ہیں۔ دونوں آیتیں حسب ذیل ہیں:

من عمل صالحا من ذکر او انثیٰ وھو مومن فلنحیینه حیاۃ طیبة ولنجزینھم اجرھم باحسن ما کانوا یعملون (نحل - ۹۷)

جو نیک عمل کرے خواہ وہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن ہو تو ہم اس کو حیات طیبہ کی زندگی دیں گے، اور ان کے عمل کا ان کو بہترین بدلہ دیں گے۔

دوسری آیت یہ ہے:

وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امنا یعبدوننی لا یشرکون بی شیئاً۔

نور - ۵۵

جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے عمل صالح کیا، ان سے اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ انہیں زمین میں اقتدار بخشے گا جس طرح پچھلوں کو اقتدار دیا تھا۔ اور ان کے لیے ان کے دین کو جما دے گا اور ان کے خوف کو امن سے بدل دے گا۔ وہ میری عبادت کریں گے میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔

"حیاۃ طیبہ" سے مراد یہ ہے کہ شخصی طور پر ایک آدمی کو اچھی اور ستھری زندگی حاصل ہو۔ ایک مفسر کے الفاظ میں اس اچھی اور ستھری زندگی کے اجزا ر مثال کے طور پر یہ ہیں ـــــ" دنیا میں حلال روزی قناعت، غنائے قلبی، سکون وطمانیت، ذکر اللہ کی لذت، حب الٰہی کا مزہ، ادائے فرض عبودیت کی خوشی، کامیاب مستقبل کا تصور، تعلق مع اللہ کی حلاوت، وغیرہ"۔ یہ چیزیں جس کو ملتی ہیں اس کی زندگی تنگی اور فراخی ہر حال میں بہترین کیفیات سے مالا مال رہتی ہے۔

دوسری چیز استخلاف اور تمکین ہے۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ کی وہ نصرت ہے جو اجتماع اور معاشرہ کے اوپر نازل ہوتی ہے۔ ایک مفسر کے الفاظ میں:

"یہ خطاب فرمایا حضرت نے وقت کے لوگوں کو۔ یعنی جو ان میں اعلیٰ درجے کے نیک اور رسول کے کامل متبع ہیں، رسول کے بعد ان کو زمین کی حکومت دے گا اور رجو دین اسلام

خدا کو پسند ہے ان کے ہاتھوں سے دنیا میں اس کو قائم کرے گا۔ گویا جیسا کہ لفظ استخلاف میں اشارہ ہے، وہ لوگ محض دنیوی بادشاہوں کی طرح نہ ہوں گے۔ بلکہ پیغمبر کے جانشین ہو کر آسمانی بادشاہت کا اعلان کریں گے۔ اور دین حق کی بنیادیں جما دیں گے۔ اس وقت مسلمانوں کو کفار کا خوف مرعوب نہ کرے گا۔ وہ کامل امن و اطمینان کے ساتھ اپنے پروردگار کی عبادت میں مشغول رہیں گے۔ اور دنیا میں امن و امان کا دور دورہ ہوگا۔ ان مقبول و معزز بندوں کی ممتاز شان یہ ہوگی کہ وہ خالص خدائے واحد کی بندگی کریں گے جس میں ذرہ برابر شرک کی آمیزش نہ ہوگی۔ صرف ایک خدا کے غلام ہوں گے، اسی سے ڈریں گے، اسی سے امید رکھیں گے، اسی پر بھروسہ کریں گے۔ اسی کی رضا میں ان کا جینا اور مرنا ہوگا۔ کسی دوسری ہستی کا خوف و ہراس ان کے پاس نہ پھٹکے گا۔ نہ کسی دوسرے کی خوشی ناخوشی کی پروا رکھیں گے"۔

ان دونوں آیتوں میں جس شخصی اور اجتماعی نعمت کا ذکر ہے، ان کے دینے کی نسبت اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف کی ہے اور دونوں میں ان کے استحقاق کی ایک ہی مشترک بنیاد بتائی گئی ہے، اور وہ ہے — ایمان اور عمل صالح۔ گویا حیات طیبہ اور تمکین فی الارض کے حصول کا راز اللہ تعالیٰ کے حصول میں پوشیدہ ہے اگر ہم حقیقی معنوں میں مومن بن جائیں اور عمل صالح کی زندگی اختیار کریں تو وہ خدا جو مالک الملک ہے، جو حالات کو کنٹرول کرتا ہے اور واقعات عالم کو الٹتا پلٹتا رہتا ہے، وہ ہمارے لیے ایسے اسباب و حالات پیدا کرے گا کہ ایک طرف ہم ذاتی طور پر دین کی حقیقت کو پالیں، اور دوسری طرف اگر ہمارا ایمان اور عمل صالح اجتماعی سطح پر پہونچ جائے تو خدا کی نصرت پورے اجتماعی دائرے کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی اور ہماری کوششیں ایسے موافق رخ اختیار کریں گی جن کے اجتماعی نتائج نکلنے لگیں۔

مولانا الیاس صاحبؒ کے نزدیک یہ نصرت کا تصور تبلیغ کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اس سے مبلغ کو وہ قوت اور وہ سہارا حاصل ہوتا ہے کہ وہ ہر ماحول اور ہر قسم کے حالات میں دینی کام کا آغاز کر سکے اور ایک ناقابل شکست اعتماد کے ساتھ اپنے کام کو آخر تک جاری رکھے۔ یہ ایک طرف مبلغ کی قوت ہے، دوسری طرف وہ اس یقینی امید کا سرچشمہ بھی ہے کہ جس کے اوپر تبلیغ کی جا رہی ہے اس کا دل بھی خدا ہی کی مٹھی میں ہے اور وہ اس کو زیر کر کے رہے گا۔

دل سے خطاب

اکتوبر ۱۹۳۰ء کا واقعہ ہے۔ ڈاکٹر محمد اقبال اپنے لاہور کے مکان میں آرام کرسی پر نیم دراز ہیں۔ حقہ

سامنے ہے اتنے میں ایک شخص داخل ہوتا ہے۔ علیک سلیک اور رسمی مزاج پرسی کے بعد گفتگو شروع ہوتی ہے۔

"آپ ایک کتاب لکھیے" ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔

"کیسی کتاب" نو وارد نے پوچھا۔

تحقیقات کرنے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ ہندوستان کے قصبات اور دیہات میں ہزارہا غیر مسلم حلقۂ اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان از خود مسلمان ہونے والوں سے ملے اور ان سے قبولِ اسلام کے اسباب دریافت کرکے ایک کتاب میں جمع کر دے تو اس سے تبلیغ اسلام کے مقصد کو بے حد تقویت حاصل ہوگی۔

"کیا صداقت اسلام کے متعلق پہلے دلائل ناکافی ہیں؟"

"بہت کافی ہیں۔ مگر ایسا کرنے سے کئی ایسے عجیب اور جدید دلائل آپ کو ملیں گے کہ دنیا حیرت زدہ رہ جائے گی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ دل اور دماغ کے کام کرنے کے طریقوں میں بہت فرق ہے۔ دماغ اکثر اوقات ہزارہا مضبوط دلائل کو مسترد کر دیتا ہے اور ان کی کچھ بھی پروا نہیں کرتا۔ لیکن دل اس کے برعکس بعض اوقات کمزور سے کمزور چیزوں سے اس قدر متاثر ہو جاتا ہے کہ صرف ایک ہی جھٹکے میں زندگی کا سارا نقشہ بدل جاتا ہے۔ قبولِ اسلام کا تعلق جس قدر دل سے ہے، دماغ سے نہیں۔ اصل بات جو مبلغ کو معلوم ہونا چاہیے، یہ ہے کہ وہ کون کون سے نشتر ہیں جن سے دل متاثر ہوا کرتے ہیں۔ کفار اور مشرکین کے انقلاب حیات کی ہزارہا مثالیں تاریخ اسلام میں موجود ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص اپنے حالات کے تحت ایک خیال یا ایک مذہب پر چٹان کی طرح قائم ہوتا ہے۔ ناگہاں غیب سے اس کے دل پر ایک نشتر چلتا ہے اور چشم زدن میں اس کی زندگی کی تمام گزشتہ تاریخ بدل جاتی ہے۔ صداقت اسلام کے عقلی دلائل تو آپ کے پاس بہت ہیں۔ مگر قلبی دلائل کم ہیں۔ اگر آپ نومسلموں کے پاس جائیں تو وہ بتائیں گے کہ اسلام کی وہ کون سی بے ساختہ ادا تھی جو ان کے دل کو بھا گئی۔ اگر ان کے بیانات ایک کتاب میں جمع کر دیئے جائیں تو مجھے یقین ہے کہ انقلاب حیات کی ایک بالکل نئی دنیا مبلغین کے سامنے آجائے گی اور انہیں اشاعت اسلام کے لیے ایسے نئے دلائل یا جدید ہتھیار مل جائیں گے جن سے اسلام کا موجودہ کتب خانہ خالی ہے۔"

اس کے بعد مثال کے طور پر چند واقعات بیان کرنے کے بعد ڈاکٹر اقبال نے مزید کہا:

"قبول اسلام میں اصل چیز دل ہے۔ جب دل ایک تبدیلی پر رضامند ہو جاتا ہے اور کسی بات پر قرار پکڑ لیتا ہے تو پھر باقی تمام جسم اس کے سوا کچھ نہیں کرتا کہ وہ اس تبدیلی کی تائید کے لیے وقف ہو جائے۔

ہمیں اسلام کے قدیم وجدید مبلغوں میں ایک واضح فرق نظر آتا ہے۔ قدیم مبلغوں کا وار غیر مسلموں کے دلوں پر ہوتا تھا۔ وہ اپنی للّٰہیت، بے نفسی، خوش خلقی اور احسان ومروّت کی جادو اثر اداؤں سے دلوں کو گرویدہ کرتے تھے۔ اور اس طرح ہزارہا لوگ از خود بغیر کسی بحث وتکرار کے ان کے رنگ میں رنگ جاتے تھے۔ مگر جدید مبلغوں کا سارا زور دماغ کی تبدیلی پر صرف ہوتا ہے۔ وہ صداقت اسلام پر ایک دلیل دیتے ہیں۔ مقابلہ میں دوسری حجت غیر مسلم پیش کر دیتے ہیں۔ اس پر بحث وتکرار شروع ہو جاتی ہے۔ مسلمان اپنی بات پر اڑ جاتا ہے۔ غیر مسلم اپنے قول پر تن جاتا ہے۔ اس سے ضد پیدا ہو جاتی ہے۔ اور ہدایت ختم ہو جاتی ہے۔"

"مبلّغین اسلام کو دلوں کے متاثر کرنے کے لیے نکلنا چاہیئے یا دماغوں کے" ڈاکٹر اقبال نے مزید تفصیل کرتے ہوئے کہا۔" اس کے فیصلے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ ہم فطرت کی روش کی پیروی کریں۔ غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ فطرت اپنی فتوحات حاصل کرنے کے لیے اپنا تعلق ہمیشہ دلوں سے جوڑتی ہے۔ فطرت کھانے میں لذت پیدا کرتی ہے اور آپ اسے بے اختیار کھا جاتے ہیں۔ اس وقت ایک بھی شخص دماغ سے یہ نہیں پوچھتا۔ کیا یہ کھانا طبّی لحاظ سے مفید ہوگا۔ آپ کہیں جا رہے ہوتے ہیں کہ ناگہاں پھولوں کی ایک خوشنما زمین اور لب جو کا ایک حسین نظارہ سامنے آجاتا ہے، آپ وہاں بے اختیار بیٹھ جاتے ہیں، وہیں ٹھنڈی ہوا کا ایک دلنواز جھونکا آتا ہے اور آپ کو میٹھی نیند سلا دیتا ہے۔ اس وقت کوئی بھی شخص دماغ سے یہ نہیں پوچھتا کہ مجھے سونا چاہیئے یا نہیں۔ مختصر یہ کہ فطرت ہر کام میں اسی طرح دلوں کو گرویدہ کر کے مطلب نکالتی ہے۔ وہ دماغوں کی طرف کبھی متوجہ نہیں ہوتی۔ اسلام چونکہ سر بسر نور فطرت ہے۔ اس واسطے مبلّغین اسلام کو چاہیئے کہ اخلاق ومحبت کی گیرائیوں سے دلوں کو اس طرح شکار کریں کہ ان میں سرکشی اور انکار کی سکت ہی باقی نہ رہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ مبلّغ اسلام، اسلامی کیرکٹر کی عظمت کے مالک ہوں۔ تاکہ سرکش سے سرکش آدمی بھی ان کے سامنے اپنی گردن جھکا دیں۔ باقی رہے دماغی مباحث اور عقلی تکرار، تو اس سے نہ تو دل مطمئن ہو سکتے ہیں نہ منقلب ہو سکتے ہیں۔ اور نہ فطرت رام ہو سکتی ہے۔"

شاید یہ کہنا صحیح ہوگا کہ مولانا الیاس صاحبؒ کی ذات اور ان کی پھیلائی ہوئی تبلیغ، کم از کم مسلمانوں کے اندر کام کی حد تک۔ ڈاکٹر اقبال کے اسی خواب کی تعبیر ہے۔ مولانا کی پوری زندگی اور تبلیغی تحریک کی پوری تاریخ اس طریق تبلیغ کی مثالوں سے بھری پڑی ہے اور اس کے حیرت انگیز نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ یہاں واقعات کو جمع کرنا مقصود نہیں ہے۔ میں اصل مدعا کو واضح کرنے کے لیے صرف ایک مثال نقل کروں گا۔

ایک عربی مدرسہ کے کچھ طلبہ مولانا الیاس صاحب کے یہاں حاضری کے لیے نظام الدین گئے۔ اس

میں ایک نہایت شریر طالب علم بھی تھا جس کو اس کے ساتھیوں نے کہہ سن کر وہاں جانے کے لیے راضی کیا تھا۔ جانے کو تو وہ طالب علم چلا گیا۔ مگر جب رات ہوئی اور لوگ سو گئے تو وہ کچھ ساتھیوں کو لے کر سینما دیکھنے کے لیے دہلی روانہ ہو گیا۔ ان لوگوں کو نظام الدین سے دہلی جانے کے لیے تو بس مل گئی مگر دوسرا شو دیکھ کر جب وہ فارغ ہوئے تو واپسی کے لیے کوئی بس نہیں تھی۔ مجبوراً رات کو یہ لوگ دہلی ہی میں رہ گئے۔

یہاں نظام الدین میں صبح کی نماز کے بعد حسب معمول جب مولانا الیاس صاحب وعظ کے لیے ممبر پر بیٹھے تو انہوں نے کہا ـــــ مدرسہ کے لوگ جو کل شام کو آئے ہیں وہ سب قریب آجائیں "۔ اس وقت وہاں صرف دو طالب علم تھے۔ مولانا نے کہا خیر انتظار کیجیے۔ وہ لوگ شاید ضروریات کے لیے کہیں گئے ہوں واپس آجائیں گے تو گفتگو شروع ہو گی۔ مگر وہ لوگ کافی دیر بعد نظام الدین پہونچے۔ اب ان کا معاملہ مشتبہ ہو گیا نیز بعض ذریعوں سے بھی معلوم ہو گیا کہ وہ لوگ سینما دیکھنے کے لیے دہلی گئے ہوئے تھے۔

اس وقت مذکورہ مدرسہ کے ناظم صاحب بھی نظام الدین میں موجود تھے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ طلبہ نے یہاں آکر اس قسم کی "بے ہودگی" کی ہے تو وہ سخت برہم ہوئے۔ مذکورہ طالب علم کے بارے میں پہلے ہی سے ان کی رائے خراب تھی۔ کیونکہ وہ مدرسہ میں بُری عادتوں کی وجہ سے کافی بدنام تھا۔ وہ اس قدر ڈھیٹ ہو چکا تھا کہ ایک بار مدرسہ کی انجمن کے لیے چندہ وصول کرنے گیا اور اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے ۲۰ ہزار روپے چندہ وصول کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ مگر روپیہ ملا تو اس نے پورے روپیہ کی ناولیں خرید ڈالیں اور ان کے پارسل انجمن کے کتب خانہ کے نام روانہ کر دیئے۔ یہاں جب ذمہ داران مدرسہ کو معلوم ہوا تو انہوں نے بندھے ہوئے بنڈل بازار میں بھجوا دیئے اور انہیں ردی میں فروخت کرا دیا۔

رات کے واقعہ کے بعد یہ سارے واقعات ناظم صاحب کے ذہن میں آگئے۔ اس سے پہلے اس کو سمجھانے بجھانے کی ساری کوششیں ناکام ہو چکی تھیں۔ انہوں نے سوچا کہ اب یہ لڑکا ناقابل اصلاح ہو چکا ہے اور مدرسہ کو مزید بدنامی سے بچانے کے لیے اس کا فوراً اخراج ہونا چاہیئے۔ چنانچہ انہوں نے مدرسہ کے صدر مدرس کو خط لکھا کہ فلاں طالب علم نے یہاں آکر ہمارے مدرسہ کو سخت بدنام کیا ہے اس کا نام فوراً مدرسہ سے خارج کر دیا جائے۔

ادھر جو صاحب اس طالب علم کو کہہ سن کر نظام الدین بلا گئے تھے وہ پریشان ہوئے۔ ان کی سمجھ میں آیا کہ مولانا الیاس صاحب سے یہ تمام بات کہہ دی جائے۔ چنانچہ تنہائی میں حاضر ہو کر انہوں نے مولانا کو پورا واقعہ بتا دیا۔ مولانا نے کہا ٹھیک ہے۔ فکر نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ سب درست فرما دے گا۔ اس کے بعد عصر کی نماز پڑھ کر جب شام کی مجلس ہوئی تو مولانا نے قلم کاغذ اور لفافہ منگوایا۔ اور

مدرسہ کے ناظم صاحب کو قریب بلاکر کہا کہ آپ کے مدرسہ کے صدر مدرس صاحب کے نام ایک خط میں املاکراتا ہوں اس کو لکھیے۔ اس کے بعد انہیں کے ہاتھ سے اس مضمون کا خط لکھوایا کہ "آپ کے مدرسہ سے کچھ لڑکے یہاں آئے۔ میں ان سے بہت خوش ہوں۔ وہ یہاں سے بہت کچھ لے کر جارہے ہیں۔ میری خصوصی دعائیں ان کے ساتھ ہیں۔ اور آپ سے گزارش ہے کہ آپ ان سے اعزاز واکرام کا معاملہ فرمائیں۔ اس کے بعد ناظم صاحب سے کہا کہ آپ بھی اس پر اپنی تصدیق لکھئے۔ ناظم صاحب نے خاموشی سے تصدیق لکھ دی۔ اور اس کے بعد مولانا نے اپنے ہاتھ سے وہ خط لفافہ میں بند کرکے اپنے خاص آدمی کو دیا کہ جاؤ ڈاک میں ڈال آؤ۔

اس واقعہ کا اتنا زبردست اثر ہوا کہ مدرسہ کا سب سے زیادہ شریر طالب علم وہاں کا سب سے زیادہ شریف اور سنجیدہ طالب علم بن گیا۔ اور تبلیغ کا باقاعدہ کارکن ہوگیا۔ لوگ اس سے پوچھتے کہ تمہاری زندگی میں اتنا زبردست تغیر کیسے ہوگیا تو وہ صرف ایک جملہ کہتا ــــ "مولانا الیاس نے مجھے چھین لیا"۔ جس شخصیت کو مدرسہ کا علم اور ناظم کے اختیارات قابو میں نہیں لاسکے تھے۔ اس کو اخلاق کی طاقت نے مسخر کرلیا۔

اس طرح کے واقعات سے مولانا الیاس صاحب کی زندگی اور تبلیغی تحریک کی تاریخ بھری ہوئی ہے دعا اور محبت اخلاق اور خیر خواہی نے ہزاروں قلوب کو جیتنے میں حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے۔ اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ تبلیغ کی زبان میں ایک عجیب تسخیری شان پیدا ہوگئی ہے۔ آپ تبلیغ کے کسی بھی جلسے میں شریک ہوکر اس کے مقررین کی تقریریں سنیئے۔ آپ محسوس کریں گے کہ یہاں ایک ایسی زبان استعمال ہورہی ہے جو ساری تحریکوں سے جدا ہے۔ اس زبان کے اجزا رہیں ـــــ سادگی، گھلاوٹ حقیقت رسی، فطرت سے قریب تر استدلال، روح کو مانوس کرنے والا انداز، دل کو چھیدنے والے کلمات۔ اور یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ تبلیغ کے کارکن، ڈاکٹر اقبال کے الفاظ میں، دل کی راہ سے چلتے ہیں۔ اس لیے خواہ ان کے یہاں عقلی ساز وسامان کم ہو مگر دل والی باتوں کی بہتات ہے اور یہ اس کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔

پروگرام

مولانا الیاس صاحب نے اپنے کام کا جو ابتدائی خاکہ بنایا تھا، اس کو وہ چھ نکات کی شکل میں بیان کرتے تھے:۔

۱۔ کلمۂ اسلام کو دلوں میں بٹھانا۔

۲۔ نماز کو اس کی حقیقی شکل میں قائم کرنا۔

۳۔ دین کا علم سیکھنا۔

۴۔ اکرامِ مسلم۔

۵۔ تفریغ وقت۔ یعنی دنیوی مشاغل سے اپنے وقت کو فارغ کر کے جماعت کی شکل میں باہر نکلنا

۶۔ تصحیح نیت اور اخلاص و احتساب۔

ان چھ نکات کو اگر مزید گھٹایا جائے تو اس کو تین پر تقسیم کیا جا سکتا ہے ـــــ کلمۂ توحید، نماز اور تفریغ وقت بقیہ تینوں اجزاء در اصل انہیں چیزوں کے تقاضے ہیں جو ان کو صحیح طور پر اختیار کرنے کے بعد لازماً پیدا ہوتے ہیں۔ ان کو الگ سے بیان کرنا محض وضاحت کے لیے ہے نہ کہ تعین کے لیے۔

مولانا الیاس صاحب کے اس دعوتی پروگرام کی تشریح مختلف الفاظ میں بیان کی جا سکتی ہے۔ خود مولانا اس کو "حضورؐ کے طریقہ کو زندہ کرنے کی کوشش" کا نام دینا پسند کرتے تھے اور اسی قسم کے الفاظ اور اصطلاحات میں اس کی وضاحت فرماتے تھے۔ بلاشبہ یہ الفاظ آپ کی دعوت کو اس کی اصل حیثیت میں ظاہر کرنے کے لیے موزوں ترین بلکہ محبوب ترین ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو جدید انداز میں سوچتے ہیں اور جنہیں کسی بات کی صداقت کا اسی وقت پورا اطمینان ہوتا ہے جب وہ اس کی تعبیر نفسیاتی، عمرانی یا فلسفیانہ الفاظ میں سن لیں، ان کے ذوق کی رعایت سے بھی اس پروگرام کے بارے میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

مولانا الیاس صاحب کی دعوت میں کلمۂ توحید کو اولین اور بنیادی حیثیت حاصل ہے ـــــ کلمۂ توحید کیا ہے۔ اس بات کا یقین کہ خدا ہی اس کائنات کا مرجع و مولیٰ ہے اور اس کے رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی وہ شخص ہیں جن کے ذریعہ مکمل صداقت کا ظہور ہوا ہے۔ ایک شخص جب لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کہتا ہے تو گویا وہ اپنی اس اندرونی کیفیت کا اظہار کرتا ہے کہ اس نے اس یقین کو اپنے دل میں جگہ دی ہے۔ اور وہ زندگی کے اس طریقہ پر آنے کا اعلان کر رہا ہے جو ایک طرف اس یقین کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے کہ خدا ہی حقیقتہً وہ وجود ہے جو انسان کے جذبات اور امنگوں کا مرکز ہے اور وہی وہ ہستی ہے جس پر اس کو سارے معاملات میں بھروسہ اور اعتماد کرنا چاہیے اور دوسری طرف یہ اعلان گویا اس بات کا اظہار ہے کہ آدمی اس احساس سے سرشار ہے کہ وہ زندگی کا راستہ پا چکا ہے اور اسے معلوم ہو چکا ہے کہ سچائی کا سرچشمہ کیا ہے جس کی رہنمائی میں اسے اپنا سفر جاری رکھنا چاہیے۔

یہ یقین و اعتماد اور یہ شرح صدر ہی در اصل وہ چیز ہے جو سارے انقلابات کی بنیاد ہے۔ دنیا

کے کسی بھی انقلاب کی تاریخ پڑھ لیجئے۔ آپ کو ملے گا کہ اسی قسم کا احساس ــــ خواہ وہ باعتبار حقیقت صحیح ہو یا غلط ــــ کچھ لوگوں میں پیدا ہو گیا تھا اور وہی بالآخر تحریک اور انقلاب کا سبب بنا۔ فرانس کا انقلاب، کمیونزم کی کامیابیاں اور مختلف ملکوں میں قومی آزادی کی جدوجہد دراصل اسی قسم کے احساس کی بنیاد پر شروع ہوئی اور اسی کی بنیاد پر جیتی گئی۔ ابتداءً ان میں سے کسی تحریک کے پاس نہ تو ہتھیار تھے نہ مال و دولت کی کثرت، حتیٰ کہ آئندہ بننے والے نظام کا کوئی تفصیلی نقشہ بھی نہیں تھا۔ ان کا اوّل و آخر سرمایہ بس ایک تخیل تھا جو ان کے دل و دماغ میں بسا ہوا تھا۔ اور وہ یہ کہ ان پر سیاسی، معاشی یا قومی "سچائی" کا انکشاف ہوا ہے۔ اس احساس نے ان کے دل و دماغ میں آگ لگادی، ان کی قوتوں کو مجتمع کیا۔ انہیں مستقبل سے بے پروا کرکے وقت کے خلاف کھڑا کردیا۔ اور انہیں ایک ایسی مجنونانہ جدوجہد میں لگادیا جس کا آخری انجام صرف کامیابی ہو سکتا تھا۔

یہ اس یقین کا انجام تھا جو صرف جزئی نوعیت کا تھا اور جس کو ہم صحیح بھی نہیں سمجھتے۔ پھر وہ یقین جو کلّی صداقت کی بنیاد پر پیدا ہو اور جو فی الواقع صداقت ہو نہ کہ محض غلط فہمی سے صداقت سمجھ لیا گیا ہو، ایسی صداقت اگر دلوں میں اتر جائے اور ایسے دین کے لیے اگر جنون پیدا ہو جائے تو اس کا کیا انجام ہوگا؟ دوسری تحریکوں نے اگر کسی جغرافی خطہ یا زندگی کے کسی گوشہ کے لیے ذہن کو متحرک کیا ہے تو یہ عقیدہ سارے کرۂ ارض کے لیے انسان کو بے تاب کر دینے والا ہے۔ دوسری تحریکوں کے افراد اگر ملک و قوم کے نام پر توپوں کے دہانے کے آگے کھڑے ہو گئے تو وہ تحریک جس کے افراد مالک کائنات کے اعتماد پر اٹھے ہوں ان کے سیل رواں کو کون روک سکتا ہے۔ دوسری تحریک کے افراد اگر اپنے خود ساختہ تخیلات کی برتری سے لوگوں کو مرعوب کر سکتے تھے تو عالم کل اور خالق فطرت کے دیے ہوئے تصورات میں جہاں گیری کی کیا کچھ طاقت ہوگی۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا الیاس صاحبؒ امت کو جو کلمہ دینا چاہتے تھے وہی دین کی اصل بنیاد ہے۔ وہ اس زمین کی عظیم ترین طاقت ہے۔ اس بنا پر اس تحریک کو کلمہ کی تحریک کہا جا سکتا ہے۔ مگر ایسا کہنے والوں کو یاد رکھنا چاہئے کہ ہر تحریک جو بھی دنیا میں اٹھی ہے وہ ابتداءً کلمہ ہی کی تحریک تھی خواہ وہ انقلابی تحریک ہو یا غیر انقلابی تحریک۔ اور خواہ اس کا کلمہ سیاسی کلمہ ہو یا معاشی کلمہ یا قومی کلمہ۔ پھر دینی کلمہ کی بنیاد پر اگر کوئی تحریک اٹھے تو اس کو محدود یا ناقص کس بنا پر کہا جا سکتا ہے، جب کہ دینی کلمہ سارے کلمات کا جامع ہے۔

مولانا کی دعوت کا دوسرا جزء نماز ہے۔ عام طور پر لوگ نماز کی حقیقت اور اہمیت کو نہیں

جانتے اس لیے وہ اس کی واقعی عظمت کو نہیں سمجھ سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح کلمہ کو ذہنی طور پر بنیادی حیثیت حاصل ہے، اسی طرح نماز کا انسان کی عملی زندگی میں بنیادی مقام ہے۔ نماز اپنی اصلی اور اندرونی حقیقت کے اعتبار سے خدا کی طرف متوجہ ہونے اور اس سے حیاتی ربط قائم کرنے کا نام ہے۔ نماز بندے کو اپنے رب سے اس طرح جوڑتی ہے کہ وہ گویا کہ اسے دیکھنے لگتا ہے اور اس سے اس کی سرگوشیاں جاری ہو جاتی ہیں۔ نماز وہ مقام ہے جہاں خدا اپنے بندوں سے ملاقات کرتا ہے۔ جب آدمی نماز کو اس کے سارے ارکان کے ساتھ ٹھیک ٹھیک ادا کرتا ہے اور دل و دماغ کی پوری یکسوئی کے ساتھ اس میں مشغول ہوتا ہے تو وہ ایک اور ہی دنیا میں پہونچ جاتا ہے۔ اس کی روح ایک ایسے تجربے سے دوچار ہوتی ہے جہاں عبدیت اور معبودیت کی حدیں ملنے لگتی ہیں۔ بندگی، خدائی کے جلوؤں میں نہا اٹھتی ہے۔

یہ تجربہ انسان کی شخصیت کو ایک نئی جِلا دیتا ہے اور اس کو ایسی عجیب و غریب نعمتیں عطا کرتا ہے جس کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن میں نماز کی حقیقت کی مکمل تفصیل ہے۔ یہاں میں مختصراً چند کا ذکر کرتا ہوں۔

ان میں سے ایک چیز وہ ہے جس کو قرآن میں "خشوع" کہا گیا ہے۔ خشوع کے معنی ہیں فروتنی عاجزی اور جھکاؤ۔ نماز کی شکل میں آدمی جب خدا کے سامنے حاضر ہوتا ہے اور اس کو یاد کرتا ہے تو خدا کی خدائی اور اپنی بندگی کا احساس اس پر اس طرح طاری ہوتا ہے کہ اس کے اندر ایک قسم کی عاجزی اور فروتنی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک ایسا وجود سمجھنے لگتا ہے جو خدا کے سامنے ہمیشہ جھکا رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کے اندر سے کبر نکل جاتا ہے جو اکثر برائیوں کا سرچشمہ ہے۔ کمزور کے اوپر طاقت ور کا ظلم، ماتحت کے اوپر افسر کا بُرا سلوک، قانونی طور پر بہتر پوزیشن والے کا قانونی طور پر کمتر پوزیشن والے کو دبانا، صاحب اثر شخص کا بے اثر اشخاص کو خاطر میں نہ لانا، صاحب مال کا بے مال لوگوں سے بے اعتنائی برتنا، اکثریت کے افراد کا اقلیت کے افراد کو لوٹنا، غرض جب بھی کوئی زور آور آدمی بے زور افراد کو تختۂ مشق بناتا ہے تو ایسی تمام صورتوں میں ہمیشہ کبر ہی اس کی خاص وجہ ہوتی ہے۔ اگر کسی معاشرے کے افراد میں کبر کا خاتمہ ہو جائے تو بے شمار برائیوں کا خود بخود خاتمہ ہو جائے گا۔

نماز کا دوسرا فائدہ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ —— "وہ برائی اور بے حیائی کے کاموں سے روکتی ہے۔" نماز میں آدمی اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ وہ خدا کا بندہ ہے، وہ اس بات کا وعدہ کرتا ہے کہ وہ خدا کا تابعدار بن کر زندگی گزارے گا، وہ اس آنے والے دن کو یاد کرتا ہے جب اس کی زندگی

کاحساب ہوگا اور عذاب وثواب کی ترازو قائم کی جائے گی۔ یہ سب باتیں اگر سچے دل سے ہوں تو زندگی کو بدل دینے کے لیے بالکل کافی ہے۔

نماز کا ایک اور اہم ترین پہلو وہ ہے جس کو "ذکر" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے خدا کی یاد سے دل کا معمور رہنا اس طرح نماز گویا اس بات کے لیے آدمی کو تیار کرتی ہے کہ اس کے دل ودماغ ان صحیح ترین خیالات سے بھرے رہیں جو حقیقتہً کسی کے ذہن وقلب میں ہونے چاہئیں۔ یہ فکر اور جذبات کی اعلاترین تربیت ہے۔

یہ نماز کے وہ نتائج ہیں جو نفسیاتی اور سماجی پہلو رکھتے ہیں اور جن کے اثرات معاشی، معاشرتی اور سیاسی زندگی میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اگرچہ نماز کی اصلی حقیقت تو یہ ہے کہ بندہ خدا کے آگے اپنا سر رکھ دے اور اس کا دل کہہ رہا ہو ——— "خدایا میں تیرا ہوگیا۔ تو بھی میرا ہوجا۔"

مولانا کی دعوت کا تیسرا جزو تفریغ وقت ہے۔ اس کام کے لیے "چلّہ" کا لفظ سن کر بعض لوگوں کو توحش ہوتا ہے۔ حالانکہ یہ صرف ایک اعتباری مدت ہے جو تربیت اور دعوت کی اس دوگونہ مہم کے لیے مقرر کی گئی ہے۔ تفریغ وقت دراصل اس حقیقت کا مظہر ہے کہ آدمی اپنے عقیدے میں اتنا بے تاب ہوچکا ہے کہ اس کے لیے اپنی مصروفیتوں کو چھوڑ کر گھر سے باہر نکل پڑا ہے۔ ایمان کے ساتھ تبلیغ کا سودا بھی اس کے سر میں سما گیا ہے، وہ اپنے درد کو سارے عالم کا درد بنا دینا چاہتا ہے۔ یہ کیفیت جب عملی شکل اختیار کرتی ہے تو تبلیغ کی اصطلاح میں اسی کا دوسرا نام وقت فارغ کرنا یا اس کی ایک مقرر مدت کا نام چلّہ ہے۔

مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے گشت اور تبلیغی سفر کے طریقے پر جو اس قدر زور دیا اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی ہے کہ اس کے اندر تبلیغی فائدوں کے علاوہ بہت سے تعلیمی تربیتی اور اصلاحی فائدے بھی چھپے ہوئے ہیں۔ آدمی جب تبلیغ کی راہ میں دور دور کے سفر پر نکلتا ہے تو وہ دین سیکھتا ہے اپنی اخلاقی اصلاح کرتا ہے، لوگوں کی حالت دیکھ کر اپنے اندر دینی کام کی اہمیت کا احساس پیدا کرتا ہے قربانیاں اور مشقتیں اس کے اندر وہ سوز اور تڑپ پیدا کرتی ہیں جس کے بعد ایک طرف وہ دین داری کی حقیقی لذت سے آشنا ہوتا ہے اور دوسری طرف اس کی زبان سے نکلے ہوئے تبلیغی کلمات میں جان پڑ جاتی ہے۔

لوگوں کو باہر نکالنا مولانا الیاس صاحبؒ کے دینی طریق کار کی جان ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعہ سے یہ موقع ملتا ہے کہ لوگوں کو ان کے ماحول سے نکال کر ایک دینی ماحول میں پہونچایا جائے اور اس کے

بعد ان کے اوپر تبلیغ کی جائے تاکہ وہ خالی الذہن ہو کر دین کی باتیں سنیں اور مختلف ماحول میں جاکر اس کا اثر زائل کرنے کے بجائے مسلسل اس سے اثر لیتے رہیں۔ یہ طریقہ عملی طور پر کافی مفید ثابت ہوا ہے اور اس کے ایسے نتائج نکلے ہیں کہ وہ لوگ جنہوں نے قریب سے کبھی جاننے کی کوشش نہیں کی وہ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔

تبلیغ کے لیے نکلنا، حدیث کے الفاظ میں، اپنے قدموں کو دین کی راہ میں گرد آلود کرنا ہے۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ جو قدم دین کی راہ میں گرد آلود ہوں، ان کو دوزخ کی آگ کبھی نہ چھوئے گی۔ سرکس میں بعض آدمی یہ کرتب دکھاتے ہیں کہ وہ آگ کے الاؤ میں مجسم کود پڑتے ہیں اور ان پر آگ کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ یہ لوگ اپنے جسم پر خاص طرح کی مالش کر لیتے ہیں۔ اس مالش کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے کہ آگ انہیں چھو نہیں سکتی۔ اسی طرح دین کی راہ کی گرد وہ چیز ہے جو دوزخ کی آگ کو بے اثر کر دینے والی ہے۔ جس کے اوپر یہ گرد پڑ گئی وہ گویا دوزخ کی آگ سے محفوظ ہو گیا۔

یہ غلط فہمی نہ ہو کہ مولانا الیاس صاحب یا ان کے پیروؤں کے نزدیک تبلیغ کا گشت بذات خود وہ چیز ہے جس سے لازمی طور پر یہ نتیجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اس سے مراد کسی خاص گروہ کا گشت نہیں بلکہ دین کا گشت ہے۔ کسی کا گشت اسی وقت اس حدیث کا مصداق بنے گا جب کہ وہ حقیقۃً دین کا گشت ہو، اور جتنا زیادہ وہ دین کے لیے ہوگا اتنا ہی زیادہ اس کا مصداق ہوگا اور دین سے اس کا تعلق جتنا کم ہوگا اتنا ہی اس کا مصداق ہونا مشتبہ ہوتا چلا جائے گا۔ کسی خاص گروہ سے نسبت اس کو حدیث کا مصداق نہیں بنا سکتی۔

مولانا الیاس صاحب نے ایک مرتبہ فرمایا:

> "ہمارے طریق کار میں دین کے واسطے جماعتوں کی شکل میں گھروں سے دور نکلنے کو بہت زیادہ اہمیت ہے۔ اس کا خاص فائدہ یہ ہے کہ آدمی اس کے ذریعہ اپنے دائمی اور جامد ماحول سے نکل کر ایک نئے صالح اور متحرک ماحول میں آجاتا ہے۔ جس میں اس کے دینی جذبات کے نشو و نما کا بہت کچھ سامان ہوتا ہے۔ نیز اس سفر و ہجرت کی وجہ سے جو طرح طرح کی تکلیفیں مشقتیں پیش آتی ہیں اور در بدر پھرنے میں جو ذلتیں اللہ کے لئے برداشت کرنی ہوتی ہیں ان کی وجہ سے اللہ کی رحمت خاص طور سے متوجہ ہو جاتی ہے۔"

وسیع تصور

مولانا الیاس صاحب نے اپنے زمانہ میں تبلیغ کا کام جس ڈھنگ سے چلایا تھا، اس کے متعلق

مولانا فرماتے تھے کہ ـــــ " یہ تبلیغ کی الف ب ہے " اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ الف ب کوئی اور چیز ہوتی ہے اور و - ہ - ی کوئی دوسری چیز۔ حقیقت یہ ہے کہ جو الف . ب ہے وہی و - ہ - ی بھی ہے۔ مگر جن لوگوں کی نگاہیں ظواہر پر ہوتی ہیں اور جو لوگ حقائق کا ان کی گہرائیوں کے ساتھ مشاہدہ نہیں کر سکتے۔ ان کو بتانا پڑتا ہے کہ قطرہ کس طرح پھیل کر بحر بیکراں بنتا ہے۔ قطرہ ہی کا دوسرا نام بحر بیکراں بھی ہے۔ مگر عام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قطرہ کوئی دوسری چیز ہے اور بحر بے کراں کوئی اور چیز۔

مولانا الیاس صاحب کے اس قول کو اس مثال کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے جیسے کوئی ڈرائیور اسٹیم تیار کر رہا ہو۔ اور وہ کہے کہ یہ تو میرے کام کی الف بے ہے۔ اسٹیم تیار کرنا ایک لحاظ سے کام کی الف ہے اور ایک لحاظ سے وہی سارا کام ہے۔ کیونکہ اسٹیم کے بغیر نہ انجن چل سکتا ہے اور نہ گاڑی حرکت میں آسکتی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ اسٹیم کے بغیر کوئی انجن اپنی منزل پر نہیں پہونچ سکتا بلکہ اس کے بغیر دو قدم چلنا بھی اس کے لیے ناممکن ہے۔

کام کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ پہلے ہی دن از اوّل تا آخر کام کا پورا خاکہ بنا لیا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اس اصل بنیاد کو پکڑ لیا جائے جو دوسرے تمام اجزا کے لیے اساس کی حیثیت رکھتی ہے۔ پہلا طریقہ پارلیمنٹ کی قانون سازی کا ہے اور دوسرا تحریک کا۔ پارلیمنٹ کا اصول اگر تحریک کے لیے اختیار کیا جائے تو اس سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کے ساتھ اسی اصول کے تحت معاملہ کیا کہ آغاز نبوت میں دین کی صرف بنیادی باتوں کی تعلیم دی گئی اور لمبی مدت تک اسی پر سارا زور دیا جاتا رہا۔ اس کے بعد جیسے جیسے حالات آگے بڑھتے گئے، بقیہ چیزیں نازل کی جاتی رہیں۔

اس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ اصل اساس مضبوط ہو جاتی ہے۔ اور اساس کی مضبوطی کے بغیر کوئی بھی عمارت کھڑی نہیں کی جا سکتی۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اسلامی عقیدہ کی رو سے ہر کام کی توفیق خدا ہی سے ملتی ہے۔ ذاتی زندگی ہو یا اجتماعی زندگی، ان پر عمل کرنے میں آدمی اسی وقت کامیاب ہوتا ہے جب اس کے ساتھ خدا کی توفیق بھی شامل حال ہو جائے۔

مولانا الیاس صاحب نے ایک مرتبہ اس سوال پر کلام کرتے ہوئے کہ " مسلمانوں کو حکومت واقتدار کیوں نہیں بخشا جاتا " فرمایا :

> اللہ کے احکام اور اوامر ونواہی کی حفاظت و رعایت جب تم اپنی ذات اور اپنی منزلی زندگی میں نہیں کر رہے ہو (جس پر تمہیں اختیار حاصل ہے اور کوئی مجبوری نہیں ہے)

تو دنیا کا نظم و نسق کیسے تمہارے حوالے کر دیا جائے۔ ایمان والوں کو حکومت ارضی دینے سے تو منشاءِ الٰہی یہی ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی مرضیات اور اس کے احکام کو دنیا میں نافذ کریں تو تم جب اپنے حدود اختیار میں آج یہ نہیں کر رہے ہو تو دنیا کی حکومت تمہارے سپرد کر کے کل کے لیے تم سے اس کی کیا امید کی جا سکتی ہے۔"

تبلیغ میں قلم

ایک نیاز مند سے (جن کو مولانا کے تبلیغی کام سے بھی تعلق تھا اور اس کے علاوہ تحریر و تصنیف ان کا خاص مشغلہ تھا) ایک دن مولانا نے فرمایا —— "میں اب تک اس کو پسند نہیں کرتا تھا کہ اس تبلیغی کام کے سلسلے میں کچھ زیادہ لکھا پڑھا جائے اور تحریر کے ذریعہ اس کی دعوت دی جائے۔ بلکہ میں اس کو منع کرتا رہا۔ لیکن اب میں کہتا ہوں کہ لکھا جائے اور تم بھی خوب لکھو۔ مگر یہاں کے فلاں فلاں کام کرنے والوں کو میری یہ بات پہونچا کر ان کی رائے بھی لے لو" چنانچہ ان نامزد حضرات کو مولانا کی بات پہونچا کر مشورہ طلب کیا گیا۔ ان صاحبان نے اپنی رائے یہ ظاہر کی کہ اس بارے میں اب تک جو طرز عمل رہا ہے، وہی اب بھی رہے۔ ہمارے نزدیک یہی بہتر ہے۔

اس کے بعد مولانا کو یہ بات پہونچائی گئی۔ مولانا نے دوبارہ فرمایا —— "ہم پہلے بالکل کس مپرسی کی حالت میں تھے۔ کوئی ہماری بات سنتا نہیں تھا۔ اور کسی کی سمجھ میں ہماری بات آتی نہیں تھی۔ اس وقت یہی ضروری تھا کہ ہم خود ہی چل پھر لوگوں میں پہلے طلب پیدا کریں۔ اور عمل سے اپنی بات سمجھائیں اس وقت اگر تحریر کے ذریعے عام دعوت دی جاتی تو لوگ کچھ کا کچھ سمجھتے۔ اور اپنے سمجھنے کے مطابق ہی رائے قائم کرتے اور اگر بات کچھ دل کو لگتی تو اپنی سمجھ کے مطابق کچھ سیدھی کچھ الٹی اس کی عملی تشکیل کرتے اور پھر جب نتائج غلط نکلتے تو ہماری اسکیم کو ناقص کہتے۔ اس لیے ہم یہ بہتر نہیں سمجھتے تھے کہ لوگوں کے پاس تحریر کے ذریعہ ہماری دعوت پہونچے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اس کی مدد سے اب حالات بدل چکے ہیں۔ ہماری بہت سی جماعتیں ملک کے اطراف میں نکل کر کام کا طریقہ دکھلا چکی ہیں۔ اور اب لوگ ہمارے کام کے طالب بن کر خود ہمارے پاس آتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ہم کو اتنے آدمی دے دیئے ہیں کہ اگر مختلف اطراف میں طلب پیدا ہو اور کام سکھانے کے لیے جماعتوں کی ضرورت ہو تو جماعتیں بھیجی جا سکتی ہیں۔ تو اب ان حالات میں بھی کس مپرسی والے ابتدائی زمانہ ہی کے طریقہ کار کے ہر ہر جزء پر جمے رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ اس لیے میں کہتا ہوں کہ تحریر کے ذریعے بھی دعوت دینی چاہیئے۔"

بعض مواقع پر مولانا نے اس کا بھی اظہار فرمایا کہ اس وقت جس قسم کے کارکن ہمارے گرد جمع ہیں

اس کے مطابق کام ہو رہا ہے، اور دوسری دوسری صلاحیتوں والے لوگ آئیں تو کام میں مزید اضافہ ہو۔

قلم کے ذریعہ کے بارے میں مولانا کے جو خیالات تھے، ان کو غالباً حسب ذیل طور پر بیان کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ کوئی تحریک جب نئی نئی شروع ہوتی ہے تو ایک اہم مسئلہ اس کے صحیح تعارف کا ہوتا ہے اس وقت ضرورت ہوتی ہے کہ داعی کی زبان بذات خود زیادہ سے زیادہ تعارف کا ذریعہ بنے۔ مگر ایک وقت آتا ہے جب دعوت ساری فضا میں گونج اٹھتی ہے اور اس کی صدا سے سارا ماحول آشنا ہو جاتا ہے۔ اس وقت غلط تعارف کا اندیشہ بہت کم ہو جاتا ہے۔ کچھ الفاظ اصطلاح عام بن کر لوگوں کے ذہنوں میں جگہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اس وقت مقرر یا محرر کے الفاظ ہی دعوت کے تعارف کا کام نہیں کرتے بلکہ ان کے ساتھ سننے والے کا اپنا وہ ذہن بھی شامل ہو جاتا ہے جو پہلے سے اس دعوت کے بارے میں ایک تعارف سے آشنا ہو چکا ہے۔ جب کوئی تحریک اس دوسرے مرحلہ پر پہونچ جائے تو ان ابتدائی تحفظات کی ضرورت نہیں رہتی جو دعوت کے آغاز میں ضروری سمجھے گئے تھے۔

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہر تحریک کے لیے کام کرنے کے سیکڑوں پہلو ہوتے ہیں۔ مگر عملی طور پر تحریک انھیں کاموں میں حصہ لیتی ہے جس کے لیے اس کے پاس کارکن موجود ہوں۔ ایسا کام جس کے لیے کارکن ہی حاصل نہ ہوں اس کو چھیڑنے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ مولانا الیاس صاحب کا کام ابتداءً جس نقشہ کے مطابق چلا، ایک لحاظ سے اگرچہ اس کی اہمیت یہ تھی کہ وہ بنیادی اور اصلی کام تھا، مگر اس کے ظاہری ڈھانچہ میں اس واقعہ کا بھی دخل تھا کہ اس وقت جس نوعیت کے کارکن فراہم ہوئے وہ اسی ڈھنگ سے کام کو چلا سکتے تھے۔ اب اگر تحریک کو پھیلاؤ حاصل ہو جائے تو کام میں بھی اسی نسبت سے پھیلاؤ ہو جائے گا جیسا کہ کارکنوں کی اقسام میں پھیلاؤ ہوا ہے۔

۳۔ مولانا نے ایک مرتبہ بہت قیمتی بات فرمائی ــــ آپ نے فرمایا کہ ایک طریقہ دین کی عمومی تعلیم و تربیت کا ہے۔ اور دوسرا طریقہ وہ ہے جو "ضرورت حادثہ" کے تحت پیدا ہوتا ہے۔ پہلا جو طریقہ ہے وہی دور نبوت میں ملتا ہے اور عمومی تعلیم و تربیت اسی طریقہ پر ہونی چاہیے۔ دوسرا طریقہ حالات و ماحول کی رعایت سے پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں پہلے طریقہ میں دوامی قدر ہے اور دوسرے طریقہ میں زمانی قدر۔

مولانا کے اسی ملفوظ کی روشنی میں ہم تصنیف و اشاعت کے کام کے بارے میں ان کے نقطۂ نظر

کو سمجھ سکتے ہیں۔ موجودہ زمانے میں تصنیف و تالیف کی بے حد اہمیت ہو گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج علمی سطح پر جو مسائل چھڑے ہوئے ہیں ان کو صحیح طور پر کتابی شکل ہی میں ایک دوسرے کے سامنے لایا جا سکتا ہے۔ دور عباسیہ میں یونانی علوم کی اشاعت سے اسلام کے لیے بہت سے ذہنی مسائل پیدا ہوئے جن کے جواب کے لیے علم کلام ایجاد ہوا اور علماء نے قلم کے ذریعہ ان کا جواب دیا۔ اسی طرح دور جدید میں افکار و خیالات کا ایک نیا سیلاب امنڈ آیا ہے جو مختلف پہلوؤں سے اسلام کو چیلنج کر رہا ہے۔ ہمیں اسلام کی طرف سے اس کا جواب فراہم کرنا ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا فکر اس کام کی اہمیت کو پوری طرح تسلیم کرتا ہے۔ البتہ ان کے الفاظ میں اس کام کو ضرورت حادثہ کے تحت پیدا شدہ کام سمجھنا چاہیے نہ کہ اس کو اصلی اور عمومی کام سمجھ لیا جائے۔

اسی طرح ضرورت حادثہ کی اور بہت سی اقسام ہو سکتی ہیں مگر سب کا استقصار یہاں مقصود نہیں۔ (۱۳۸۶ھ)

حضرت جی

۲ر اپریل ۱۹۶۵ء کی شب کو تین بجے ایک ہوائی جہاز دہلی کے ہوائی اڈہ پر اترا۔ اس میں ایک مسافر تھا جو لاہور سے دہلی لایا گیا تھا۔ مسافر کی آمد ٹھیک اپنے پروگرام کے مطابق ہوئی۔ مگر اس طرح کہ اس کا جسم تو دہلی آیا اور روح اپنے رب کے پاس ابدی آرام کے لیے پہونچ چکی تھی۔

یہ مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ تھے جنہیں تبلیغ کے لوگ عام طور پر "حضرت جی" کہتے ہیں۔ وہ فروری ۱۹۶۵ء کے دوسرے ہفتہ میں براستہ لاہور ڈھاکہ کے اجتماع میں شرکت کے لیے گئے تھے۔ اس سلسلے میں سابق مشرقی پاکستان کے مختلف مقامات کا دورہ کرتے ہوئے دوبارہ مغربی پاکستان واپس آئے اور یہاں بھی مختلف شہروں میں ان کا بہت مصروف پروگرام رہا۔ اس سفر کی آخری منزل لاہور تھی۔ وہاں کے اجتماعات کی کارروائیوں میں بھی مکمل شرکت کی۔ اس کے بعد ۲ اپریل کو جمعہ کے دن بذریعہ ٹرین سہارن پور کے لیے روانہ ہونے والے تھے کہ اسی دن اچانک قلب کا حملہ ہوا اور ۲ بجے دن میں انتقال ہو گیا۔ انتقال کے بعد جنازہ رات کو لاہور سے دہلی لایا گیا۔

مولانا محمد یوسف صاحب ۲ مارچ ۱۹۱۷ء کو پیدا ہوئے۔ اپنے والد مرحوم مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد ۱۲ جولائی ۱۹۴۴ء کو تبلیغ کا کام سنبھالا اور اکیس سال تک برابر اسی کام میں لگے رہے۔ اس مختصر مدت میں اتنی زبردست کامیابی حاصل کی کہ وہ تحریک جو میوات کے اَن پڑھ مسلمانوں کو کلمہ و نماز سکھانے کی تحریک کے نام سے مشہور تھی اس کو پہلے ملکی اور پھر ایک بین اقوامی تحریک بنا دیا اور ہر طبقہ اور ہر ذہنی سطح کے لوگوں کو اس کثرت سے متاثر کیا کہ ایک بزرگ کے الفاظ میں: "اس کی نظیر قریب کی پچھلی صدیوں میں مشکل سے ملے گی۔

مولانا محمد منظور نعمانی صاحب راوی ہیں کہ مولانا محمد الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی

وفات کے چند مہینے بعد مراد آباد میں ایک تبلیغی اجتماع ہو رہا تھا۔ تبلیغ کے لیے اوقات دینے کا رواج اس وقت تک میوات سے باہر بہت ہی کم ہوا تھا۔ فجر کی نماز کے بعد مولانا محمد یوسف صاحب نے تقریر کی اور اس کے بعد اوقات کا مطالبہ شروع ہوا۔ مگر بہت کم لوگوں نے اپنے نام لکھوائے۔ بجنور، چاند پور اور رام پور جیسے قریبی مقامات کے لیے دس دس آدمیوں کی جماعتیں بھی نہیں بن سکی تھیں۔ کئی آدمی ترغیب دلانے میں مصروف تھے اور اپنا پورا زور لگا رہے تھے مگر ناموں میں بالکل اضافہ نہیں ہو رہا تھا۔ مولانا یوسف صاحب جو تقریر کرنے کے بعد مسجد کے اندرونی حصے میں چلے گئے تھے۔ لوگوں کی سرد مہری دیکھ کر یکایک اٹھے اور مائکروفون ہاتھ میں لے کر فرمانا شروع کیا کہ "آج تم بجنور، چاند پور رام پور جیسے قریبی مقامات کے لیے اور صرف تین تین دن کا وقت دینے کے لیے تیار نہیں ہو رہے ہو، ایک وقت آئے گا جب تم شام جاؤ گے، مصر جاؤ گے، عراق جاؤ گے۔ مگر اس وقت اجر گھٹ جائے گا۔ کیونکہ اس وقت اس کا عام رواج ہو چکا ہوگا۔" مولانا محمد یوسف کی یہ بات جو ۱۹۴۵ء میں ایک خیالی بات معلوم ہوتی تھی، آج واقعہ بن چکی ہے۔ تبلیغی جماعتوں کی نقل و حرکت آج نہ صرف شام و عرب بلکہ یورپ، جاپان، امریکہ، افریقہ اور اقصائے مشرق سے اقصائے مغرب تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ رات دن کا کوئی لمحہ ایسا نہیں ہوتا جب تبلیغی جماعت کے وفود دنیا کے مختلف حصوں میں گشت نہ کر رہے ہوں۔

دعوت میں انہماک

مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جن لوگوں نے بھی قریب سے دیکھا ہے (اور ایسے لوگ بلا شبہ ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں ہیں) وہ جانتے ہیں کہ مولانا کو اپنی دعوت میں کس قدر انہماک تھا۔ ایک صاحب جو لاہور میں نماز فجر کے بعد مولانا کی ایک تقریر میں شریک تھے، فرماتے ہیں کہ نماز کے بعد مولانا نے تقریر شروع کی اور پورے تین گھنٹے تک انتہائی جوش و خروش کے ساتھ مجمع کو خطاب کرتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی لاوا پھوٹ پڑا ہے اور ماحول کو گرمائے نہیں بلکہ پگھلائے جا رہا ہے۔ ۸½ بجے خطاب ختم ہوا اور ناشتہ کا دسترخوان بچھایا گیا۔ مولانا نے دسترخوان پر بیٹھتے ہی پھر گفتگو شروع فرما دی اور اس انداز سے الفاظ زبان سے نکلنے لگے کہ گفتگو کے زور، استدلال کی ندرت اور مطالب کی آمد کو دیکھ کر کوئی شخص یہ تصور نہیں کر سکتا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو ابھی تین گھنٹے کے زوردار خطاب سے فارغ ہوا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا گویا ایک بالکل تازہ دم

خطیب ہے جو بول رہا ہے۔

یہ ناشتہ کی مجلس تھی۔ مگر مولانا اپنی دعوت کی وضاحت میں اس قدر مستغرق تھے کہ انہوں نے ناشتہ کی جانب کوئی توجہ نہیں کی۔ ایک رفیق نے چائے کی پیالی پیش کی تو آپ نے پکڑلی۔ دس پندرہ منٹ تک وہ یونہی پیالی ہاتھ میں پکڑے رہے اور پھر ایک شریک مجلس کے توجہ دلانے پر آپ نے وہ چائے جو اب پانی کی طرح ٹھنڈی ہوچکی تھی، حلق میں انڈیل لی۔ دوسری پیالی یہ کہہ کر پیش کی گئی کہ حضرت یہ گرم ہے، پی لیجئے اور یہ بسکٹ بھی تناول فرمائیے۔ مگر اللہ کے اس بندے نے اس پیالی کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا۔ گفتگو میں مستغرق رہے اور ۱۰-۱۵ منٹ بعد اسے بھی پانی کی طرح پی لیا۔

اس کے بعد اٹھے اور ایک دوسرے اجتماع میں تقریر کے لیے تشریف لے گئے۔ اور یہ پہلے سے معلوم تھا کہ دوپہر سے قبل ایک تیسرا خطاب بھی کرنا ہے — یہ کوئی استثنائی واقعہ نہیں ہے۔ بلکہ یہی آپ کی روزانہ کی زندگی تھی۔

مولانا کے ایک رفیق خاص راوی ہیں:

"میرا ذاتی مشاہدہ ہے کہ وہ تقریر شروع فرمانے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ اور مراقب ہوتے تھے اور اس کے بعد تقریر شروع فرماتے تھے اور پھر ان کو خود اپنی بھی خبر نہیں رہتی تھی۔ اب سے ۸-۱۰ سال پہلے کا واقعہ ہے۔ بھوپال میں اجتماع تھا۔ ان دنوں حضرت مولانا مرحوم کی ران میں ایک بہت بڑا زخم تھا جس کا حال یہ تھا کہ حرکت کرنے سے اور زور سے تقریر کرنے سے اس میں خون جاری ہوجاتا تھا۔ مولانا اسی حال میں بھوپال تشریف لائے اور اپنی عادت کے مطابق اجتماع میں تقریریں بھی فرمائیں۔ زخم کی تکلیف کافی بڑھ گئی۔ بھوپال سے فارغ ہونے کے بعد وہاں سے ۴۰-۵۰ میل کے فاصلہ پر ایک اور اجتماع طے تھا۔ حضرت مولانا وہاں بھی تشریف لے گئے۔ لیکن طے یہ ہوا کہ یہاں مولانا تقریر نہیں فرمائیں گے۔ بلکہ فلاں ساتھی کی تقریر ہوگی۔ مگر ساتھی کی تقریر کے بعد مولانا کو احساس ہوا کہ دعوت، قوت کے ساتھ نہیں دی جاسکی تو اپنے اندرونی جذبے سے مغلوب ہوکر خود تقریر کے لیے اصرار فرمایا۔ حالت یہ تھی کہ بیٹھنے کے لائق بھی نہیں۔ چنانچہ لیٹ کر بولنا شروع کیا۔ ادھر زخم کی یہ حالت ہوئی کہ اس میں سے خون جاری ہوگیا۔ ایک کپڑا لگا دیا جاتا۔ جب وہ بالکل تر بتر ہوجاتا تو دوسرا کپڑا لگا دیا جاتا۔ اس طرح کئی کپڑے خون سے بھر گئے۔ اور مولانا نے عادت کے مطابق پوری تقریر فرمائی۔ اندازہ ہے کہ

اس تقریر کے دوران غالباً آدھا سیر خون مولانا کے جسم سے نکل گیا ہوگا۔ مگر اللہ کے اس بندے کو کچھ پتہ نہ تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔"

گھر کے لوگ، خاص طور پر بیوی کو جتنی خبر کسی شخص کی ہوتی ہے، اتنی دوسروں کو نہیں ہو سکتی۔ مولانا کی اہلیہ جو اب مرحومہ ہو چکی ہیں دق کی مریض تھیں۔ اور آخر میں حالت کافی خراب ہو گئی۔ مگر مولانا کے اوقات میں ان کا حصہ بہت کم ہوتا تھا۔ یہ دیکھ کر ایک صاحب نے اپنی بیوی کو مولانا کی اہلیہ کے پاس بھیجا اور یہ بھی ہدایت کر دی کہ اس بارے میں تم ان سے اس طرح کی جذباتی باتیں کرنا کہ ان کے دل کی بات زبان پر آجائے اور اگر مولانا سے انہیں کوئی شکایت ہو تو ظاہر ہو جائے۔ چنانچہ راوی موصوف کی اہلیہ نے مرحومہ سے بات کی۔ ان کا بیان ہے کہ انہوں نے مولانا کی طرف سے خود مدافعت کی اور کہا کہ "وہ دن رات دین کی فکر اور دین کے کام میں لگے رہتے ہیں، انہیں اپنا بھی ہوش نہیں ہے۔ میں نے خود ہی ان سے کہہ دیا ہے آپ میری فکر بالکل نہ کریں دوا علاج ہو ہی رہا ہے۔ اگر اللہ نے جنت میں جمع فرما دیا تو وہاں اطمینان سے رہنے کا موقع ملے گا۔"

چند مہینوں کے بعد اسی مرض میں خاص نماز کی حالت میں مرحومہ کا انتقال ہو گیا۔

آپ کی دعوت

یہ تڑپ اور لگن کس کام کے لیے تھی۔ صرف اس لیے کہ لوگوں کے اندر دین کا صحیح تصور آجائے اور زندگیاں اس کے مطابق چل پڑیں۔ مولانا کے نزدیک ایمان کا مطلب ایک لفظ میں یہ تھا کہ ——— "اللہ سے سب کچھ ہوتا ہے، چیزوں سے کچھ نہیں ہوتا۔" ایک مرتبہ فرمایا:

کام یہ ہے کہ کام کرنے والے کا اس ذات پر یقین قائم ہو جائے جس کے کرنے سے کام ہوگا۔ یعنی اللہ جل جلالہ کی ذات پر، اور اس کی حیثیت کام کرنے والے پر ایسی منکشف ہو کہ اپنی ذات اور کوئی دوسری ذات دکھائی نہ دے۔ دوسرا یقین یہ ہو کہ جب میں ظاہر و باطن سے حضورؐ کے طریقوں پر آجاؤں گا تو رب العزت دنیا و آخرت میں اچھے حالات لائے گا۔

ایک تقریر میں فرمایا:

"محنت کے دو میدان ہیں۔ ایک زمین اور زمین سے پیدا ہونے والی چیزیں۔ دوسرے ایمان اور ایمان والے اعمال۔ پہلی محنت کا معاوضہ دنیا میں ملتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ملتا کہ محنت کرنے والے اس پر خوش اور مطمئن ہوں۔ دوسری محنت کا معاوضہ دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ

بھرپور دے گا۔" مولانا کے نزدیک دنیوی غلبہ اسلامی زندگی کا ایک نتیجہ تھا۔ فرمایا:

"تم حضورؐ کے نمونے پر بننا شروع کردو۔ جتنا بننا ہوگا بن جائے گا اور جو بننے والا نہیں ہوگا اور بننے والوں کے لیے رکاوٹ بنے گا، خدا اسے اس طرح توڑ دے گا جیسے انڈے کے چھلکے کو توڑ دیتا ہے۔ تم جن کو بڑی طاقتیں کہتے ہو، خدا کے نزدیک ان کی حیثیت مکڑی کے جالے کے برابر بھی نہیں ہے۔ اس دنیا میں پاکیزہ انسانوں کے نہ ہونے کی وجہ سے مکڑیوں کے بڑے بڑے جالے لگ گئے تھے، جب حضورؐ کی سعی سے پاکیزہ انسان بن گئے تو خدا نے عذاب کی ایک جھاڑو سے روم و فارس کے جالے صاف کر دیئے تھے۔ بالکل یہی صورت روس اور امریکہ کی ہوگی۔"

ایک طویل مکتوب کے چند فقرے یہ ہیں:

"اللہ نے انسانوں کی تمام کامیابیوں کا دار و مدار انسان کے اندرونی مایہ پر رکھا ہے۔ کامیابی اور ناکامی انسان کے اندر کے حال کا نام ہے ..... اللہ جل شانہ ملک و مال کے ساتھ انسان کو ذلیل کر کے دکھا دیں اور فقر کے نقشہ میں عزت دے کر دکھا دیں۔ انسان کے اندر کا یقین اور اندر سے نکلنے والے عمل اگر ٹھیک ہوں گے تو اللہ جل شانہ کامیابی کی حالت پیدا فرما دیں گے خواہ چیزوں کا نقشہ کتنا ہی پست کیوں نہ ہو ...... جو کچھ قدرت سے بنا ہے وہ قدرت کے ماتحت ہے .... ہر شکل پر خواہ ملک کی ہو یا مال کی، برق کی ہو یا بھاپ کی، ان کا ہی قبضہ ہے اور وہ ہی تصرف فرماتے ہیں۔ جہاں سے انسان کو تعمیر نظر آتی ہے وہاں سے تخریب لا کر دکھا دیں اور جہاں سے تخریب نظر آتی ہے وہاں سے تعمیر لا کر کے دکھا دیں۔ .... اللہ جل شانہ کی ذاتِ عالی سے تعلق پیدا ہو جائے اور ان کی قدرت سے براہِ راست استفادہ ہو، اس کے لیے حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم اللہ کی طرف سے طریقے لے کر آئے ہیں۔ جب ان کے طریقے زندگیوں میں آئیں گے تو اللہ جل شانہٗ ہر نقشے میں کامیابی دے کر دکھائیں گے ..... آج امت میں کسی حد تک انفرادی اعمال کا رواج ہے گو ان کی حقیقت نکلی ہوئی ہے حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے طفیل پوری امت کو دعوت والی محنت ملی تھی اس کے بندوں کا تعلق اللہ جل شانہ سے قائم ہو جائے۔ اس کے لیے انبیاء علیہم السلام والے طرز پر اپنی جان و مال کو جھونک دینا اور جن میں محنت کر رہے ہیں ان سے کسی چیز کا طالب نہ بننا، اس کے لیے ہجرت بھی کرنا اور نصرت بھی کرنا..... اس راستے میں محنت کرنے والوں

فضا میں رکھا جائے۔ جب کہ آدمی عبادات و اذکار میں وقت گزارے دوسروں کو دینی زندگی اختیار کرنے کی تلقین کرے، اور اس طرح تربیت یافتہ ہو کر جب اپنے وطن واپس آئے تو آئندہ مسجد والی زندگی میں مصروف ہو جائے۔ مسجد والی زندگی ہی مولانا کے نزدیک دنیا و آخرت کی کامیابی کی ضامن تھی۔

ایک جماعت کے نام خط میں اس طرح طریق کار کی وضاحت فرماتے ہیں:

"دین سے مناسبت پیدا کرنے کے لیے ہر شخص سے خواہ کسی شعبہ سے متعلق ہو، چار ماہ کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔ اپنے مشاغل، ساز و سامان اور گھر بار سے نکل کر ان چیزوں کی دعوت دیتے ہوئے اور خود مشق کرتے ہوئے ملک بہ ملک، اقلیم بہ اقلیم، قوم بہ قوم، قریہ بہ قریہ پھریں گے۔ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم نے ہر امتی کو مسجد والا بنایا تھا۔ مسجد کے کچھ مخصوص اعمال دیئے تھے۔ مسجد میں اللہ کی بڑائی کی، ایمان کی اور آخرت کی باتیں ہوتی تھیں، اعمال سے زندگی بننے کی باتیں ہوتی تھیں، عملوں کے ٹھیک کرنے کی تعلیمیں ہوتی تھیں۔ ایمان و عمل صالح کی دعوت کے لیے ملکوں اور علاقوں میں جانے کی تشکیلیں بھی مسجد ہی سے ہوتی تھیں۔ اللہ کے ذکر کی مجلسیں مسجدوں میں ہوتی تھیں۔ یہاں تعاون، ایثار، ہمدردیوں کے اعمال ہوتے تھے، ہر شخص حاکم، محکوم، مالدار، غریب، تاجر، زارع، مزدور، مسجد میں آکر زندگی سیکھتا تھا۔ اور باہر جا کر اپنے اپنے شعبہ میں مسجد والے تاثر سے چلتا تھا۔ آج ہم دھوکے میں پڑ گئے کہ ہمارے پیسے سے مسجد چلتی ہے۔ مسجدیں اعمال سے خالی ہو گئیں اور چیزوں سے بھر گئیں۔ حضور صلعم نے مسجد کو بازار والوں کے تابع نہیں کیا حضور صلعم کی مسجد میں نہ بجلی تھی، نہ پانی تھا، نہ غسل خانے تھے، خرچ کی کوئی شکل نہ تھی۔ مسجد میں آکر داعی بنتا تھا، معلم اور متعلم بنتا تھا، ذاکر بنتا تھا۔ نمازی بنتا تھا، مطیع بنتا تھا، متقی زاہد بنتا تھا، خلیق بنتا تھا، باہر جا کر ٹھیک زندگی گزارتا تھا۔ مسجد بازار والوں کو چلاتی تھی۔ ان چار ماہ میں ہر جگہ جا کر مسجدوں میں ہر امتی کو لانے کی مشق کریں مسجد والے اعمال کو سیکھتے ہوئے دوسروں کو یہ محنت سیکھنے کے لیے تین چلّوں کے واسطے آمادہ کر دیں۔ واپس اپنے مقام پر آکر اپنی بستی کی مسجد میں ان اعمال کو زندہ کرنا ہے، ہفتہ میں دو مرتبہ گشت کے ذریعہ بستی والوں کو جمع کر کے انہیں چیزوں کی طرف متوجہ کرنا اور مشق کے لیے فی گھر ایک نفر تین چلّوں کے لیے باہر نکلنا ہے۔ ایک گشت اپنی مسجد کے ماحول میں اور دوسرا گشت دوسری مسجد کے ماحول میں کریں۔ ہر مسجد میں مقامی جماعت بھی بنائیں ہر مسجد کے احباب روزانہ

فضائل کی تعلیم کریں۔ اپنے شہر یا بستی کے قریب دیہات میں کام کی فضا بنے، اس کے لیے ہر مسجد سے تین یوم کے لیے جماعتیں پانچ کوس کے علاقے میں جائیں۔ ہر دوست ہر مہینے میں تین یوم پابندی سے لگائے۔ الحسنۃ بعشر امثالھا کے مصداق تین دن پر حکماً تیس دن کا ثواب ملے گا۔ پورے سال ہر مہینے تین دن لگائے تو سارا سال اللہ کی راہ میں شمار ہوگا۔"

اشاعت سے پرہیز

مولانا اشاعت کے عام طریقوں کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"اس کام کی تعمیم کے لیے رواجی طریقوں۔ اخبار، اشتہار، پریس وغیرہ اور رواجی الفاظ سے بھی پورے پرہیز کی ضرورت ہے۔ یہ کام سارا کا سارا غیر رواجی ہے۔ رواجی طریقوں سے رواج کو تقویت پہونچے گی اس کام کو نہیں۔ اصل کام کی شکلیں، دعوت، گشت، تعلیم تشکیل وغیرہ ہیں۔"

مولانا کے ذہن میں لٹریچر کا جو تصور تھا اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے ہوتا ہے:

"فضائل قرآن مجید پڑھ کر تھوڑی دیر کلام پاک کی ان سورتوں کی تجوید کی مشق کی جائے جو عموماً نمازوں پر پڑھی جاتی ہے۔ اللہ پاک توفیق دیں تو ہر کتاب میں سے تین چار صفحے پڑھے جائیں۔ تعلیم میں اپنی طرف سے تقریر نہ ہو، حدیث شریف پڑھنے کے بعد دو تین جملے ایسے کہہ دیئے جائیں کہ اس سے عمل کا جذبہ ابھر آئے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب دامت برکاتہم کی تالیف فرمودہ فضائل قرآن مجید، فضائل نماز، فضائل تبلیغ، فضائل ذکر فضائل صدقات حصہ اول دوم، فضائل رمضان، فضائل حج، (ایام حج و رمضان میں) اور مولانا احتشام الحسن صاحب کاندھلوی دام مجدہٗ کی (مسلمانوں کی موجودہ پستی کا واحد علاج) صرف یہ کتابیں ہیں جن کو اجتماعی تعلیم میں پڑھنا اور سننا ہے اور تنہائیوں میں بیٹھ کر بھی ان کو پڑھنا ہے۔"

اشاعت سے پرہیز کا یہ عالم تھا کہ آپ کی وفات کے بعد آپ کے مکاتیب کی تلاش میں ایک صاحب نے دہلی کا سفر کیا۔ مگر وہاں ایک مکتوب کی نقل بھی محفوظ نہیں مل سکی۔ حالانکہ آپ کثرت سے خطوط لکھتے تھے۔

غیر مسلموں میں تبلیغ

غیر مسلموں میں تبلیغ کے بارے میں مولانا کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ جب تک مسلمانوں میں دینی

زندگی پیدا نہ ہو، اغیار میں دین کے لیے کشش پیدا نہیں ہو سکتی۔ ایک دفعہ فرمایا:

"جب تک یقین اور علم نبوت کے مطابق عبادات درست نہ ہو جائیں، اخلاق نہیں آتے اور جب تک ہم میں اخلاق نہیں آئیں گے دوسروں میں دین نہیں پھیلے گا۔ اغراض کے لیے کسی سے سلوک کرنا اخلاق نہیں ہے بلکہ کوئی کام بھی جب تک اس میں اخلاص نہ ہو اس کی قطعاً کوئی قیمت نہیں ہے عمل اخلاص کے بغیر مردہ ہے اور دیکھو، گھروں، بازاروں، دفتروں، یہاں تک کہ مدارس و مساجد میں بھی ایسے مرداروں کے ڈھیر لگ رہے ہیں۔"

اسی لیے آپ کم از کم پہلے مرحلہ میں اصلاح و تبلیغ کی زیادہ تر کوشش مسلمانوں پر صرف کرنا ضروری سمجھتے تھے۔

اجتماعیت

مولانا اجتماعیت کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ اپنے رفقاء کو آپ کی ہدایت ہوتی تھی کہ "ہر کام کو اجتماعی کریں۔ حتیٰ کہ سفر میں بھی یکجا رہنے کی بھرپور کوشش کریں" مگر اجتماعیت کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر عام تصور سے کچھ مختلف تھا۔ اس کو ہم شاید اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ آپ کے نزدیک اجتماعیت کی اہمیت تھی مگر جماعت بندی کی نہیں۔ فرماتے ہیں:

"ہم نے اس کام کے لیے کوئی انجمن نہیں بنائی۔ نہ اس کا کوئی دفتر ہے نہ رجسٹر ہے نہ فنڈ ہے یہ سارے ہی مسلمانوں کا کام ہے ہم نے مروجہ طریقہ پر کوئی علٰحدہ جماعت بھی نہیں بنائی ہے۔ جس طرح مسجد میں نماز کے عمل پر مختلف طبقوں اور مشغلوں والے مسلمان آکر جڑ جاتے ہیں اور نماز سے فارغ ہو کر اپنے اپنے گھروں اور مشغلوں میں چلے جاتے ہیں اسی طرح ہم آپ سب سے کہتے ہیں کہ کچھ وقت کے لیے اپنے گھروں اور مشغلوں سے نکل کر یہ محنت اور مشق کر لیجئے۔ اور پھر اپنے گھروں اور مشغلوں میں آکر ان اصولوں کے مطابق لگ جائیے ـــــــ آپ نے اگر یہ چیز محنت کر کے حاصل کر لی تو دنیا بھر کے سائنس والے آپ سے یہ طریقہ سیکھنے آئیں گے اور خدا نے چاہا تو آپ دنیا کے امام ہوں گے۔"

حکمتِ تبلیغ

ایک تقریر میں تبلیغی کارکنوں کو ہدایات دیتے ہوئے فرمایا:

خصوصی گشت میں اگر دیکھا جائے کہ وہ صاحب جن سے آپ ملنے گئے ہیں اس وقت توجہ سے بات سننے کے لیے تیار نہیں ہیں تو مناسب طریقہ سے جلدی سے بات ختم کر کے ان کے پاس سے اٹھ آنا چاہیئے۔ اور ان کے لیے دعا کرنی چاہیئے اور اگر دیکھا جائے کہ وہ صاحب متوجہ ہیں تو پھر پوری بات ان

کے سامنے رکھنی چاہیئے .... خصوصی گشت میں جب دینی اکابر کی خدمت میں حاضری ہو تو ان سے صرف دعا کی درخواست کی جائے اور ان کی توجہ دیکھی جائے تو کام کا کچھ ذکر کر دیا جائے۔"

دعا

مولانا کی تقریروں کا خاتمہ ہمیشہ دعا پر ہوتا تھا۔ لفظ "دعا" اپنے عام استعمالی مفہوم کے لحاظ سے شاید اس کی کیفیت کو ادا کرنے سے قاصر ہے جو مولانا کی دعائیں ہوتی تھیں۔ مولانا کی دعوت کا اصل اور مغز اللہ سے استعانت اور دعا کا تعلق پیدا کرنا تھا۔ اور یہ چیز ان کی دعائیں اس طرح ابھر آتی تھی کہ اس وقت وہ اپنی دعوت کا مجسم نمونہ بن جاتے تھے۔ ایک واقف حال کے الفاظ میں "جب دعا کرتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ نہ اس سے پہلے دعا کی ہے نہ اس کے بعد کریں گے۔ سب کچھ اسی دعا میں مانگ لینا ہے اور سب کچھ اسی دعا میں کہہ دینا ہے۔" مولانا کی دعا کی کیفیت، اس کے مضامین، اس کی آمد اور جوش و خروش اس کی رقت انگیزی اور اس کی تاثیر مولانا کے ان خصائص میں سے تھی جن کی مثال دور دور دیکھنے میں نہیں آتی۔ جب دعا کرتے، حاضرین کا عجیب حال ہوتا۔ خاص طور پر جب اردو میں دعا کے الفاظ ادا فرماتے تو آنسوؤں کا سیلاب امنڈ پڑتا۔ دور دور سے رونے والوں کی ہچکیاں سننے میں آتیں۔"

ایک صاحب جو ایک اجتماع میں شریک تھے، لکھتے ہیں:

"مولانا محمد یوسف صاحب نے دعا کی۔ اپنے گناہوں کی توبہ۔ مغفرت۔ آخرت کی سرخروئی، دین کی عظمت، تمام انسانوں کے لیے ہدایت طلبی، یہ سب باتیں اللہ سے طلب کی گئیں۔ دعا یوں مانگی گئی جس طرح مانگنے کا حق ہوتا ہے۔ کوئی آنکھ نہ تھی جو روئی نہ ہو کوئی زبان نہ تھی جو ہلی نہ ہو، کوئی دل نہ تھا جو پھٹ پڑنے پر نہ آیا ہو۔ بس ایک ہی احساس تھا کہ اتنی زندگی جو گزری ناکامی میں گزری۔ میں ہی سراپا معصیت ہوں۔ سب برائیاں مجھ ہی میں ہیں۔ اے اللہ ان سب کوتاہیوں کو معاف فرما اور میری زندگی کو اپنے راستے پر لگا دے۔"

ایک دعا جو اتفاق سے ٹیپ ریکارڈر کے ذریعہ محفوظ ہو گئی ہے، اس کے چند الفاظ یہ ہیں:

اے اللہ ہمارے گناہوں کو معاف فرما..... اے خدا ہماری محنت کے بگڑ جانے کے اس جرم عظیم کو معاف فرما جس جرم عظیم سے ہزاروں خرابیاں ہم میں پیدا ہو گئی ہیں، محمد صلے اللہ علیہ وسلم جس محنت پر ڈال کر گئے اس محنت کو چھوڑ کر ہم ان محنتوں میں الجھ گئے جن محنتوں سے وہ نکال کر گئے تھے ...... اے اللہ ہمیں عصیاں کے دریاؤں سے نکال دے اور ہمیں طاعت کی سڑکوں پر ڈال دے ...

اے خداوند قدوس جس قسم کے زمانے میں تو نے اس تبلیغ کے ذریعے اس کلمہ و نماز پر محنت کی صورت پیدا فرمادی اور اپنی راہ میں نکلنے کی توفیق دی ...... اے رب کریم اپنے کرم سے سب کو قبول فرمالے اور ان سب کی ایسی تربیت فرما کہ یہ نقل وحرکت تجھے پسند آجائے ...... اے اللہ درندوں کی اور اژدہوں کی قسم سے جتنے انسان اور درندے ہیں اور جن کو تجھے انسانیت سے نوازنا ہی نہیں، اے خدا ایسے ایسوں کو چن چن کر ہلاک فرما۔ ایسوں کی زمینوں کو، ان کے لیے پھاڑ دے، ایسوں کے مکانوں کو ان پر توڑدے۔ ایسوں سے نعمتوں کو اپنی چھین لے ...... اے خدا لوٹ کھسوٹ کے ماحول کو ختم کر، ظلم وستم کے ماحول کو ختم کر، عدل وانصاف کے ماحول کو قائم کر، علم وذکر کے ماحول کو قائم کر، خدمت خلق کے ماحول پیدا کر تعاون وہمدردی ومحبت کے ماحول کو قائم کر...... اے اللہ ہماری دعاؤں کو اپنے فضل وکرم سے قبول فرما۔

مقبولیت

مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی زندگی ہی میں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی۔ بجنور کے ایک اجتماع کے مشاہد فرماتے ہیں ــــــ "اس میں حضرت مولانا اپنے تمام رفقاء کے ہمراہ تشریف لائے تھے، عقیدت مندوں کے ہجوم نے بڑی دشواری پیدا کر دی۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ میں کسی نہ کسی طرح مولانا سے مصافحہ کر لوں۔ انتظاماً قیام گاہ پر بعض میواتیوں کا پہرہ لگانا پڑا۔ پھر بھی قیام گاہ کے دروازہ کی چوکھٹ، داخلے کی بے محابا کوشش کرنے والوں کی وجہ سے اکھڑ گئی۔ جب مولانا قیام گاہ سے جلسہ گاہ میں تشریف لاتے مجمع آپ کے گرد سمندر کی طرح موجیں مارتا ہوا نظر آتا۔"

مولانا شیخ طریقت بھی تھے۔ بیعت چاروں سلسلوں میں اپنے والد ماجد صاحب کے واسطے سے کرتے تھے۔ ایک صاحب رائے ونڈ کا حال بیان کرتے ہیں۔ "ایک کثیر مجمع نے بیعت کی۔ بیعت کرنے والوں کے ہاتھوں میں پگڑیاں اور چادریں وغیرہ تھیں اور اتنا کثیر مجمع تھا کہ کئی حضرات مکبّر کی طرح پکار پکار کر الفاظ بیعت کو بیعت کرنے والوں تک پہونچا رہے تھے۔ عجیب دل کش منظر تھا۔ میرے ایک عزیز کہنے لگے کہ آج تو حضرت جی نے امام شہید (سید احمد صاحب رائے بریلوی) کی یاد تازہ کر دی۔"

تقریر

مولانا کو تقریر کا عجیب وغریب ملکہ تھا جو کچھ وہبی تھا اور کچھ ان کے دعوتی جذبہ نے ان کے اندر پیدا کر دیا تھا۔ ایک عالم کے الفاظ میں آپ کی تقریروں کو سن کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ "آپ کو اللہ

کی طرف سے ایک علم عطا ہوا ہے (جو مدرسہ اور کتب خانہ کا علم نہیں ہے) اور اسی کا نام حکمت ہے اور قوت بیان مزید برآں ہے " بعض قریبی لوگوں کا اندازہ ہے کہ آخر میں مجموعی طور پر آٹھ آٹھ گھنٹے تک بولنے کی نوبت آتی تھی۔ عجیب بات یہ ہے کہ سننے والے خواہ وہ جاہل ہوں یا عالم آپ کی تقریریں سننے سے گھبراتے نہیں تھے بلکہ پوری تقریر کے دوران ہمہ تن گوش بنے رہتے تھے۔ اور ایک کثیر تعداد کا یہ عالم ہوتا تھا کہ شدت پسندیدگی میں وہ کاغذ قلم لے کر اس کو دوران تقریر ہی میں نوٹ کرنا شروع کر دیتے تھے۔ آپ تقریر پر تقریر کرتے رہتے اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ہر بعد کی تقریر میں نئے سننے والوں کو یہ اندازہ ہوتا کہ بولنے والا اسی وقت بولنے کھڑا ہوا ہے اور اس سے پہلے اس کو اپنے خیالات وجذبات کے اظہار کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس موقع پر اپنا دل کھول کر رکھ دینا چاہتا ہے "

ایک صاحب مولانا کے ایک سفر کی روداد بیان کرتے ہیں۔ ہر جگہ جہاں آپ کا جانا ہوا " صبح وشام گھنٹوں خطاب فرماتے رہے۔ بولتے بولتے گلے میں سوجن پڑ گئی۔ ڈاکٹروں نے اصرار سے مشورہ دیا کہ کچھ دنوں کے لیے بولنا چھوڑ دیا جائے۔ مگر حضرت مولانا اس پر آمادہ نہیں ہوئے۔ حسب عادت تقریروں اور گفتگوؤں کا سلسلہ جاری رہا اور مرض ترقی کرتا گیا۔

تقریر کا انداز بھی عجیب تھا۔ بات کرتے کرتے آستین چڑھاتے پھر اتارتے۔ بیٹھ کر تقریر شروع کرتے اور پھر درمیان میں کھڑے ہو جاتے۔ کبھی درمیان کلام میں ایک آہ بھرتے جو درد اثر میں ڈوبی ہوئی عجیب کیفیت پیدا کر دیتی۔ ایک صاحب فرماتے ہیں:

" حضرت جی گھنٹوں مسلسل بیان کرتے رہتے تھے بندہ نے خود ایک دن میں حضرت کے پانچ بیان سنے ہیں۔ جن میں سے ایک ساڑھے پانچ گھنٹے کا تھا۔ یہاں علوم اندر سے پھوٹ کر نکلتے تھے۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ آپ نہیں کہہ رہے ہیں کہلوایا جا رہا ہے۔ علوم الٰہیہ کا فیضان موسلا دھار بارش کی طرح حضرت کے قلب پر ہوتا تھا "

ذوق علم

آپ کے علمی ذوق کے بارے میں آپ کے ایک قریبی واقف کار روایت کرتے ہیں کہ ایک بار مولانا نے فرمایا ـــــ " میں نے سوا ایک دفعہ کے بازار سے ایک آنہ کی بھی مٹھائی خرید کر نہیں کھائی یہ وجہ نہ تھی کہ میرے پاس پیسے نہ ہوتے تھے۔ بلکہ بات یہ تھی کہ میں نے پیسے جمع کرنے کا ایک ڈبہ بنایا تھا اور اس میں جو پیسے مجھ کو ملتے ڈال دیا کرتا تھا کہ ان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی کتابیں خریدوں گا تعلیم کے زمانے میں مولانا انعام الحسن صاحب آپ کے ساتھی اور ہم سبق تھے۔ وہ روایت کرتے ہیں کہ

"ہم دونوں نے آپس میں یہ طے کر لیا تھا کہ رات کے ابتدائی آدھے حصے میں ہم میں سے ایک مطالعہ کرے گا اور دوسرا سوئے گا۔ اور آدھی رات ہو جانے پر مطالعہ کرنے والا چائے بنائے گا اور دوسرے ساتھی کو اٹھا کر اور اس کے ساتھ چائے پی پلا کر سو جائے گا اور اسی دوسرے کے ذمہ ہو گا کہ فجر کی جماعت کے لیے سونے والے ساتھی کو اٹھائے۔ ایک دن مولانا مرحوم شروع رات میں مطالعہ کرتے تھے اور میں سوتا تھا۔ اور دوسرے دن برعکس ترتیب رہتی تھی۔"

بستی نظام الدین کی زندگی میں آپ کا معمول تھا کہ روزانہ ایک خاص وقت میں آپ اپنے مطالعہ کے کمرے میں چلے جاتے اور وہاں مقرر وقت تک مطالعہ اور تحریر کا سلسلہ جاری رہتا۔

آخر میں ایک واقعہ پر اس گفتگو کو ختم کروں گا۔ ندوہ کے ایک عالم نے مجھ سے بیان کیا ایک جلسہ میں مولانا یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر ہو رہی تھی۔ پورے مجمع پر مسحور کن خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مقرر حکمت و معرفت کی بارش برسا رہا تھا۔ جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی اس جلسہ میں موجود تھے۔ راوی کا بیان ہے کہ ایک موقع پر جب کہ تقریر اپنے عروج پر تھی۔ مولانا کی زبان سے بے اختیار نکلا ـــــ "اگر میں قسم کھاؤں تو میں حانث نہیں ہوں گا کہ اس وقت پورے عالم اسلام میں اس درجہ یقین و ایمان کے ساتھ بولنے والا کوئی دوسرا شخص موجود نہیں ہے۔" (۱۳۸۶ھ)

تعارف

امّت پنا

یہ مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی ایک تقریر ہے جو انہوں نے اپنی وفات سے صرف تین دن پہلے ۳۰ مارچ ۱۹۶۵ء کو رائے ونڈ (پاکستان) میں کی تھی۔

دیکھو میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ساری رات مجھے نیند نہیں آئی۔ اس کے باوجود ضروری سمجھ کے بول رہا ہوں۔ جو سمجھ کے عمل کرے گا، اللہ تعالیٰ اسے چمکائے گا ورنہ اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارے گا۔

یہ امت بڑی مشقت سے بنی ہے۔ اس کو امت بنانے میں حضور صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ نے بڑی مشقتیں اٹھائی ہیں۔ اور ان کے دشمنوں یہود و نصاریٰ نے ہمیشہ اس کی کوششیں کی ہیں کہ مسلمان ایک امت نہ رہیں بلکہ ٹکڑے ٹکڑے ہوں۔ اب مسلمان اپنا امت پنا کھو چکے ہیں، جب تک یہ امت بنے ہوئے تھے چند لاکھ ساری دنیا پر بھاری تھے۔ ایک پکّا مکان نہیں تھا۔ مسجد تک پکی نہیں تھی۔ مسجد میں چراغ تک نہیں جلتا تھا۔

مسجد نبوی میں ہجرت کے نویں سال چراغ جلا ہے۔ سب سے پہلا چراغ جلانے والے تمیم داریؓ ہیں۔ وہ ۹ھ میں اسلام لائے ہیں اور ۹ھ تک قریب قریب سارا عرب اسلام میں داخل ہو چکا تھا۔ مختلف قومیں، مختلف زبانیں، مختلف قبیلے ایک امت بن چکے تھے تو جب یہ سب کچھ ہو گیا اس وقت مسجد نبویؐ میں چراغ جلا۔ لیکن حضور صلے اللہ علیہ وسلم جو نورِ ہدایت لے کر تشریف لائے تھے وہ پورے عرب میں بلکہ اس کے باہر بھی پھیل چکا تھا اور امت بن چکی تھی۔ پھر یہ امت دنیا میں اٹھی۔ جدھر کو نکلی ملک کے ملک ہیروں میں گرے۔ یہ

امّت اس طرح بنی تھی کہ ان کا کوئی آدمی اپنے خاندان ، اپنی برادری ، اپنی پارٹی ، اپنی قوم ، اپنے وطن، اپنی زبان کا حامی نہ تھا ۔ مال وجائداد اور بیوی بچوں کی طرف دیکھنے والا بھی نہ تھا ۔ بلکہ ہر آدمی صرف یہ دیکھتا تھا کہ اللہ و رسولؐ کیا فرماتے ہیں ۔ امت جب ہی بنتی ہے جب اللہ و رسولؐ کے حکم کے مقابلے میں سارے رشتے اور سارے تعلقات کٹ جائیں ۔ جب مسلمان ایک امت تھے تو ایک مسلمان کے قتل ہوجانے سے ساری امت ہل جاتی تھی ۔ اب ھزاروں لاکھوں کے گلے کٹتے ہیں اور کانوں پر جوں نہیں رینگتی ۔

امت کسی ایک قوم اور ایک علاقہ کے رہنے والوں کا نام نہیں ہے بلکہ سیکڑوں ہزاروں قوموں اور علاقوں سے جُڑ کر امت بنتی ہے ۔ جو کوئی کسی ایک قوم یا ایک علاقہ کو اپنا سمجھتا ہے اور دوسروں کو غیر سمجھتا ہے وہ امت کو ذبح کرتا ہے اور اس کے ٹکڑے کرتا ہے اور حضورؐ کی اور صحابہ کی محنتوں پر پانی پھیرتا ہے ۔ امت کو ٹکڑے ٹکڑے ہو کر پہلے خود ہم نے ذبح کیا ہے ۔ یہود و نصاریٰ نے تو اس کے بعد کٹی کٹائی امت کو کاٹا ہے ۔ اگر مسلمان پھر امت بن جائیں تو دنیا کی ساری طاقتیں مل کر بھی ان کا بال بیکا نہیں کر سکتیں ۔ ایٹم بم اور راکٹ ان کو ختم نہیں کر سکیں گے ۔ لیکن اگر وہ قومی اور علاقائی عصبیتوں کی وجہ سے باہم امت کے ٹکڑے کرتے رہے تو خدا کی قسم تمہارے ہتھیار تمہاری فوجیں تم کو نہیں بچا سکیں گی ۔

مسلمان ساری دنیا میں اس لیے پٹ رہا اور مر رہا ہے کہ اس نے امت پنے کو ختم کر کے حضورؐ کی قربانی پر پانی پھیر دیا ہے ۔ میں یہ دل کے غم کی باتیں کہہ رہا ہوں ۔ ساری تباہی اس وجہ سے ہے کہ امت امت نہ رہی ۔ بلکہ یہ بھی بھول گئے کہ امت کیا ہے ، اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے کس طرح امت بنائی تھی ۔

امت ہونے کے لیے اور مسلمانوں کے ساتھ خدائی مدد ہونے کے لیے صرف یہ کافی نہیں ہے کہ مسلمانوں میں نماز ہو ، ذکر ہو ، مدرسہ ہو ، مدرسہ کی تعلیم ہو ۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قاتل ابن ملجم ایسا نمازی اور ایسا ذاکر تھا کہ جب اس کو قتل کرتے وقت غصہ میں بھرے لوگوں نے اس کی زبان کاٹنی چاہی تو اس نے کہا سب کچھ کر لو لیکن میری زبان مت کاٹو تاکہ زندگی کے آخری سانس تک میں اس سے اللہ کا ذکر کرتا رہوں ۔ اس کے باوجود حضورؐ نے فرمایا کہ علی کا قاتل میری امت کا سب سے زیادہ شقی اور بدبخت ترین آدمی ہوگا ۔ اور مدرسہ کی تعلیم تو ابوالفضل اور فیضی نے بھی حاصل کی تھی اور ایسی حاصل

کی تھی کہ قرآن پاک کی تفسیر بے نقط لکھ دی۔ حالانکہ انہوں نے ہی اکبر کو گم راہ کر کے دین کو برباد کیا۔ تھا۔ توجو باتیں ابن ملجم اور ابو الفیض فیضی میں تھیں وہ امت بننے کے لیے اور خدا کی غیبی نصرت کے لیے کیسے کافی ہو سکتی ہیں ؟

حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور حضرت سید احمد شہیدؒ اور ان کے ساتھی دین داری کے لحاظ سے بہترین مجموعہ تھے۔ وہ جب سرحدی علاقے میں پہونچے اور وہاں کے لوگوں نے ان کو اپنا بڑا بنالیا تو شیطان نے وہاں کے کچھ مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ یہ دوسرے علاقے کے لوگ ہیں۔ ان کی بات یہاں کیوں چلے۔ انہوں نے ان کے خلاف بغاوت کرائی۔ ان کے کتنے ہی ساتھی شہید کر دیئے گیے اور اس طرح خود مسلمانوں نے علاقائی بنیاد پر امت بننے کو توڑ دیا۔ اللہ نے اس کی سزا میں انگریزوں کو مسلط کیا۔ یہ خدا کا عذاب تھا۔

یاد رکھو میری قوم اور میرا علاقہ اور میری برادری یہ سب امت کو توڑنے والی باتیں ہیں اور اللہ تعالےٰ کو یہ باتیں اتنی ناپسند ہیں کہ حضرت سعدؓ بن عبادہ جیسے بڑے صحابی سے اس بارے میں جو غلطی ہوئی (جو اگر دب نہ گئی ہوتی تو اس کے نتیجہ میں انصار و مہاجرین میں تفریق ہو جاتی) اس کا نتیجہ حضرت سعدؓ کو دنیا ہی میں بھگتنا پڑا۔ روایات میں یہ ہے کہ ان کو جنات نے قتل کر دیا۔ اور مدینہ میں یہ آواز سنائی دی اور بولنے والا کوئی نظر نہ آیا :

قتلنا سید الخزرج سعد بن عبادہؓ رمینا بسهم فلم یخط فؤادہ ۔	ہم نے قبیلہ خزرج کے سردار سعد بن عبادہ کو ہلاک کر دیا۔ ہم نے اس کو تیر کا نشانہ بنایا جو ٹھیک اس کے دل پر لگا ۔

اس واقعہ نے مثال قائم کر دی اور سبق دیا کہ اچھے سے اچھا آدمی بھی اگر قومیت یا علاقہ کی بنیاد پر امت بننے کو توڑے گا تو اللہ تعالےٰ اس کو توڑ کے رکھ دے گا ۔

امت جب بنے گی جب امت کے سب طبقے بلا تفریق اس کام میں لگ جائیں جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم دے کے گیے ہیں۔ اور یاد رکھو امت بننے کو توڑنے والی چیزیں معاملات اور معاشرت کی خرابیاں ہیں۔ ایک فرد یا طبقہ جب دوسرے کے ساتھ ظلم اور ناانصافی کرتا ہے اور اس کا پورا حق اس کو نہیں دیتا یا اس کو تکلیف پہونچاتا ہے۔ یا اس کی تحقیر اور بے عزتی کرتا ہے تو تفریق پیدا ہوتی ہے اور امت بنا

ٹوٹتا ہے۔

اس لیے میں کہتا ہوں کہ صرف کلمہ اور تسبیح سے امت نہیں بنے گی۔ امت معاملات اور معاشرت کی اصلاح سے اور سب کا حق ادا کرنے اور سب کا اکرام کرنے سے بنے گی، بلکہ جب بنے گی جب دوسروں کے لیے اپنا حق اور اپنا مفاد قربان کیا جائے گا۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ نے اپنا سب کچھ قربان کرکے اور اپنے پر تکلیفیں جھیل کے اس امت کو امت بنایا تھا۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک دن لاکھوں کروڑوں روپے آئے۔ ان کی تقسیم کا مشورہ ہوا۔ اس وقت امت بنی ہوئی تھی۔ یہ مشورہ کرنے والے کسی ایک ہی قبیلہ یا ایک ہی طبقے کے نہ تھے بلکہ مختلف طبقوں اور قبیلوں کے وہ لوگ تھے جو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی صحبت کے اعتبار سے بڑے اور خواص سمجھے جاتے تھے انہوں نے مشورہ سے باہم طے کیا کہ تقسیم اس طرح پر ہو کہ سب سے زیادہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے قبیلہ والوں کو دیا جائے، اس کے بعد حضرت ابو بکرؓ کے قبیلہ والوں کو، پھر حضرت عمرؓ کے قبیلہ والوں کو۔ اس طرح حضرت عمرؓ کے اقارب تیسرے نمبر پر آئے۔ جب یہ بات حضرت عمرؓ کے سامنے رکھی گئی تو آپ نے اس مشورہ کو قبول نہیں کیا اور فرمایا کہ اس امت کو جو کچھ ملا ہے اور مل رہا ہے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی وجہ سے اور آپ کے صدقے میں مل رہا ہے، اس لیے بس حضور صلے اللہ علیہ وسلم کے تعلق کو معیار بنایا جائے۔ جو نسب میں آپ سے زیادہ قریب ہوں ان کو زیادہ دیا جائے، جو دوم، سوم، چہارم نمبر پر ہوں ان کو اسی نمبر پر رکھا جائے۔ اس طرح سب سے زیادہ بنی ہاشم کو دیا جائے، اس کے بعد بنی عبد مناف کو، پھر قُصَیٰ کی اولاد کو، پھر کلاب کو، پھر کعب کو، پھر مرّہ کی اولاد کو، اس حساب سے حضرت عمرؓ کا قبیلہ بہت پیچھے پڑجاتا تھا اور اس کا حصہ بہت کم ہوجاتا تھا۔ مگر حضرت عمرؓ نے یہی فیصلہ کیا اور مال کی تقسیم میں اپنے قبیلہ کو اتنے پیچھے ڈال دیا۔ اس طرح بنی تھی یہ امّت!

امت بننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ سب کی یہ کوشش ہو کہ آپس میں جوڑ ہو پھوٹ نہ پڑے۔ حضورؐ کی ایک حدیث کا مضمون ہے کہ قیامت میں ایک آدمی لایا جائے گا جس نے دنیا میں نماز، روزہ، حج، تبلیغ سب کچھ کیا ہوگا مگر وہ عذاب میں ڈالا جائے گا، کیونکہ اس کی کسی بات نے امت میں تفریق ڈالی ہوگی اس سے کہا جائے گا پہلے اپنے اس ایک لفظ کی سزا بھگت لے جس کی وجہ سے امت کو نقصان پہونچا۔ اور ایک دوسرا آدمی ہوگا جس کے پاس نماز، روزہ، حج وغیرہ کی بہت کمی ہوگی اور وہ خدا کے عذاب سے بہت

ڈرتا ہوگا، مگر اس کو بہت ثواب سے نوازا جائے گا۔ وہ خود پوچھے گا کہ یہ کرم میرے کس عمل کی وجہ سے ہے۔ اس کو بتایا جائے گا کہ تونے فلاں موقع پر ایک بات کہی تھی جس سے امت میں پیدا ہونے والا ایک فساد رک گیا اور بجائے توڑ کے جوڑ پیدا ہوگیا۔ یہ سب تیرے اسی لفظ کا صلہ اور ثواب ہے۔

امت کے بنانے اور بگاڑنے میں، جوڑنے اور توڑنے میں سب سے زیادہ دخل زبان کا ہوتا ہے یہ زبان دلوں کو جوڑتی بھی ہے اور پھاڑتی بھی ہے۔ زبان سے ایک بات غلط اور فساد کی نکل جاتی ہے۔ اور اس پر لاٹھی چل جاتی ہے اور پورا فساد کھڑا ہوجاتا ہے۔ اور ایک ہی بات جوڑ پیدا کردیتی ہے اور پھٹے ہوئے دلوں کو ملا دیتی ہے۔ اس لیے سب سے زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ زبانوں پر قابو ہو۔ اور یہ جب ہوسکتا ہے جب بندہ ہر وقت اس کا خیال رکھے کہ خدا ہر وقت اور ہر جگہ اس کے ساتھ ہے اور اس کی ہر بات کو سن رہا ہے۔

مدینہ میں انصار کے دو قبیلے تھے اوس اور خزرج۔ ان میں پشتوں سے عداوت اور لڑائی چلی آرہی تھی۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم جب ہجرت فرماکر مدینہ پہونچے اور انصار کو اسلام کی توفیق ملی تو حضورؐ کی اور اسلام کی برکت سے ان کی پشتوں کی لڑائیاں ختم ہوگئیں اور اوس و خزرج شیر و شکر ہوگئے یہ دیکھ کر یہودیوں نے اسکیم بنائی کہ کسی طرح ان کو پھر سے لڑایا جائے۔ ایک مجلس میں جس میں دونوں قبیلوں کے آدمی موجود تھے، ایک سازشی آدمی نے ان کی پرانی لڑائیوں سے متعلق کچھ شعر پڑھ کے اشتعال پیدا کردیا، پہلے تو زبانیں ایک دوسرے کے خلاف چلیں، پھر دونوں طرف سے ہتھیار نکل آئے۔ حضورؐ سے جاکر کسی نے کہا آپ فوراً تشریف لائے اور فرمایا کہ میرے ہوتے ہوئے تم آپس میں خون خرابہ کروگے آپ نے بہت مختصر مگر درد سے بھرا ہوا خطبہ دیا۔ دونوں فریقوں نے محسوس کرلیا کہ ہمیں شیطان نے ورغلایا دونوں روئے اور گلے ملے اور یہ آیتیں نازل ہوئیں يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ ط الخ

"اے مسلمانو خدا سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنا چاہیے اور مرتے دم تک پورے پورے مسلم اور خدا کے فرماں بردار بندے بنے رہو۔" جب آدمی ہر وقت خدا کا خیال رکھے گا، اس کے قہر و عذاب سے ڈرتا رہے گا اور ہر دم اس کی تابعداری کرے گا تو شیطان بھی اسے نہیں بہکا سکے گا۔ اور امت پھوٹ سے اور ساری خرابیوں سے محفوظ رہے گی۔

واعتصموا بحبل اللہ جمیعًا ولا تفرقوا واذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذکنتم اعداءً فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہٖ اخوانا ط وکنتم علیٰ شفاحفرۃ من النار فانقذکم منھا ۔

" اور اللہ کی رسّی کو یعنی اس کی کتاب پاک اور اس کے دین کو سب مل کر مضبوطی سے تھامے رہو، یعنی پوری اجتماعیت کے ساتھ اور امت بننے کی صفت کے ساتھ سب مل جل کر دین کی رسی کو تھامے اور اس میں لگے رہو اور قوم کی بنیاد پر یا علاقہ کی بنیاد پر یا زبان کی بنیاد پر، یا کسی اور بنیاد پر ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو۔ اور اللہ کے اس احسان کو نہ بھولو کہ اس نے تمہارے دلوں کی وہ عداوت اور دشمنی ختم کر کے جو پشتوں سے تم میں چلی آرہی تھی، تمہارے دلوں میں الفت پیدا کردی اور تمہیں باہم بھائی بھائی بنادیا۔ اور تم آپس میں لڑتے وقت دوزخ کے کنارے پر کھڑے تھے بس گرنے ہی والے تھے کہ اللہ نے تم کو تھام لیا اور دوزخ سے بچالیا۔"

شیطان تمہارے ساتھ ہے اس کا علاج یہ ہے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہو جس کا موضوع ہی بھلائی کی اور نیکی کی طرف بلانا اور ہر برائی اور ہر فساد سے روکنا ہو۔

ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر و اولئک ھم المفلحون ط

امت میں ایک گروہ وہ ہو جس کا کام اور موضوع ہی یہ ہو کہ وہ دین کی طرف اور ہر قسم کے خیر کی طرف بلائے۔ ایمان کے لیے اور خیر اور نیکی کے راستہ پر چلنے کے لیے محنت کرتا رہے، نمازوں پر محنت کرے ، ذکر پر محنت کرے، حضورؐ کے لائے ہوئے علم پر محنت کرے، برائیوں اور معصیتوں سے بچانے کے لیے محنت کرے اور ان محنتوں کی وجہ سے امت ایک امت بنی رہے۔

ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ماجاءھم البینٰت ط واولئک لھم عذاب عظیم ط

"جو لوگ ان ہدایتوں کے بعد بھی شیطان کی پیروی کر کے اور الگ الگ راہوں پہ چل کے اختلاف پیدا کریں گے اور امت کے امت بننے کو توڑیں گے تو ان پر خدا کی سخت مار پڑے گی۔ (اولئک لھم عذاب عظیم)

دین کی ساری تعلیم اور ساری چیزیں جوڑنے والی اور جوڑنے کے لیے ہیں۔ نماز میں جوڑ ہے. روزہ میں جوڑ ہے، حج میں قوموں اور ملکوں اور مختلف زبان والوں کا جوڑ ہے۔ تعلیم کے حلقے جوڑنے والے ہیں، مسلمانوں کا اکرام اور باہم محبت اور تحفہ تحائف کا لین دین یہ سب جوڑنے والی اور جنت میں لے جانے والی چیزیں ہیں اور قیامت میں ان اعمال کے لیے محنتیں کرنے والوں کے چہرے نورانی ہوں گے، اور ان کے برخلاف باہم بغض وحسد، غیبت، چغل خوری، توہین وتحقیر اور دل آزاری یہ سب پھوٹ ڈالنے والے اور توڑنے والے اور دوزخ میں لے جانے والے اعمال ہیں اور ان اعمال والے آخرت میں روسیاہ ہوں گے۔

یوم تبیض وجوہ وتسود وجوہ ط فاما الذین اسودت وجوھھم اکفرتم بعد ایمانکم فذوقوا العذاب بما کنتم تکفرون ط واما الذین ابیضت وجوھھم ففی رحمۃ اللہ ط ھم فیھا خالدون ط

"جنہوں نے پھوٹ ڈال کے اور پھوٹ والے اعمال کر کے امت کو توڑا ہوگا، وہ قیامت کے دن قبروں سے کالے منہ اٹھیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ تم نے اسلام و ایمان کے بعد کفر والوں کا طریقہ اختیار کیا۔ اب تم یہاں دوزخ کا عذاب چکھو اور جو ٹھیک راستہ پر چلتے رہے ہوں گے ان کے چہرے نورانی اور چمکتے ہوئے ہوں گے اور وہ ہمیشہ اللہ کی رحمت میں اور جنت میں رہیں گے۔"

میرے بھائیو اور دوستو! یہ سب آیتیں اس وقت اتری تھیں، جب یہود نے انصار میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی تھی اور ان کے دو قبیلوں کو ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کر دیا تھا۔ ان آیتوں میں مسلمانوں کی باہمی پھوٹ اور لڑائی کو کفر کی بات کہا گیا ہے اور آخرت کے عذاب سے ڈرایا گیا ہے۔ آج ساری دنیا میں امت پنا توڑنے کی محنت چل رہی ہے، اس کا علاج اور توڑ یہی ہے کہ تم اپنے کو حضور صلے اللہ علیہ وسلم والی محنت میں لگا دو، مسلمانوں کو مسجدوں میں لاؤ، وہاں ایمان کی باتیں ہوں۔ تعلیم اور ذکر کے حلقے ہوں۔ دین کی محنت کے مشورے ہوں۔ مختلف طبقوں کے اور مختلف برادریوں کے اور مختلف زبانوں والے لوگ مسجد نبوی کے طریقہ پر ان کاموں میں جڑیں۔ جب امت پنا آئے گا۔ ان باتوں سے بچیں جن سے شیطان کو پھوٹ ڈالنے کا موقع ملے۔ جب تین بیٹھیں تو اس کا خیال رکھیں کہ چوتھا ہمارے ساتھ اللہ ہے۔ چار پانچ بیٹھیں تو ہمیشہ یاد رکھیں کہ پانچواں یا چھٹا اللہ ہمارے ساتھ ہی

موجود ہے اور وہ ہماری ہر بات سن رہا ہے اور دیکھ رہا ہے کہ ہم امت بنانے کی بات کر رہے ہیں یا امت پنا توڑنے کی۔ ہم کسی کی غیبت اور چغل خوری تو نہیں کر رہے۔ کسی کے خلاف سازش تو نہیں کر رہے۔ یہ امت حضورؐ کے خون اور فاقوں سے بنی تھی۔ اب ہم اپنی معمولی معمولی باتوں پر امت کو توڑ رہے ہیں۔ یاد رکھو نماز جمعہ چھوڑنے پر بھی اتنی پکڑ نہیں ہوگی جتنی امت کو توڑنے پر ہوگی۔ اگر مسلمانوں میں امت پنا آجائے تو وہ دنیا میں ہرگز ذلیل نہ ہوں گے، روس اور امریکہ کی طاقتیں بھی ان کے سامنے جھکیں گی اور امت پنا جب آئے گا جب "اذلۃٍ علی المومنین"، پر مسلمانوں کا عمل ہو۔ یعنی ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے مقابلہ میں چھوٹا بننے اور ذلت و تواضع اختیار کرنے کو اپنائے۔ تبلیغ میں اسی کی مشق کرنی ہے۔ جب مسلمانوں میں "اذلۃٍ علی المومنین" والی صفت آجائے گی تو وہ دنیا میں "اعزۃٍ علی الکٰفرین" یعنی کافروں کے مقابلہ میں زبردست اور غالب ضرور ہوں گے چاہے وہ کافر یورپ کے ہوں یا ایشیا کے۔

میرے بھائیو دوستو! اللہ و رسولؐ نے ان باتوں سے شدت اور سختی سے منع فرمایا ہے جن سے دلوں میں فرق پڑے اور پھوٹ کا خطرہ بھی ہو، دو دو چار چار الگ کانا پھوسی کریں اس سے شیطان دلوں میں بدگمانی پیدا کر سکتا ہے اس سے منع فرمایا گیا اور اس کو شیطانی کام بتایا گیا۔

"انما النجویٰ من الشیطٰن لیحزن الذین اٰمنوا ولیس بضارھم شیئًا الا باذن اللہ" اسی طرح تحقیر اور استہزا اور تمسخر سے منع فرمایا گیا۔

"لا یسخر قوم من قوم عسیٰ ان یکونوا خیراً منھم" اس سے بھی منع فرمایا گیا کہ دوسرے کی کوئی برائی جو معلوم نہ ہو اس کو تجسس کرکے معلوم کیا جائے اور جو برائی کسی کی معلوم ہو گئی ہو اس کو دوسروں کے سامنے ذکر کرنے سے منع فرمایا گیا، اور غیبت کو حرام کیا گیا۔ غیبت اس کا نام ہے کہ جو واقعی برائی کسی کی معلوم ہو اس کا ذکر کسی سے کیا جائے۔ "ولا تجسسوا ولا یغتب بعضکم بعضًا" یہ تحقیر اور تمسخر اور تجسس اور غیبت سب وہ چیزیں ہیں جو آپس میں تفرقہ پیدا کر کے امت پنے کو توڑتی ہیں، ان سب کو حرام قرار دیا گیا اور ایک دوسرے کا اکرام و احترام کرنا جس سے امت جڑتی بنتی ہے اس کی تاکید فرمائی گئی اور دوسروں سے اپنا اکرام چاہنے سے منع کیا گیا۔ کیونکہ اس سے امت بنتی نہیں بگڑتی ہے۔ امت جب بنے گی جب ہر آدمی یہ طے کرے کہ میں عزت کے قابل نہیں ہوں اس لیے مجھے عزت لینی نہیں بلکہ دوسروں کی عزت کرنی ہے اور دوسرے سب لوگ

اس قابل ہیں کہ میں ان کی عزت کروں، ان کا اکرام کروں۔

اپنے نفسوں اور اپنی ذاتوں کو قربان کیا جائے گا تو امت بنے گی اور امت بنے گی تو عزت ملے گی، عزت اور ذلت روس اور امریکہ تک کے نقشوں میں نہیں ہے بلکہ خدا کے ہاتھ میں ہے اور اس کے ہاں اصول وضابطہ ہے۔ جو شخص یا قوم، خاندان، طبقہ چمکانے والے اصول اور اعمال لاوے گا اس کو چمکا دیں گے، جو مٹنے والے کام کرے گا اس کو مٹا دیں گے، یہود نبیوں کی اولاد ہیں، اصول توڑے تو اللہ نے ٹھوکر مار کے ان کو توڑ دیا۔ صحابہ کرامؓ بت پرستوں کی اولاد تھے، انہوں نے چمکانے والے اصول اختیار کئے تو اللہ نے ان کو چمکا دیا، اللہ کی رشتہ داری کسی سے نہیں ہے، اس کے یہاں اصول اور ضابطہ ہے۔

دوستو! اپنے کو اس محنت پر جھونک دو کہ حضورؐ کی امت میں امت پنا آجائے، اس میں ایمان ویقین آجائے، یہ ذکر وتسبیح اور تعلیم والی، خدا کے سامنے جھکنے والی، خدمت کرنے والی، برداشت کرنے والی، دوسروں کا اعزاز واکرام کرنے والی امت بن جائے۔ نجوی نہ کرنے والی، نافرمانی نہ کرنے والی اپنے بھائیوں اور ساتھیوں کی تحقیر وتمسخر اور تجسس وغیبت نہ کرنے والی امت بن جائے۔ اگر کسی ایک علاقہ میں بھی یہ محنت اس طرح ہونے لگے جس طرح ہونی چاہیے تو ساری دنیا میں بات چل پڑے۔

اب اس کا اہتمام کرو کہ مختلف قوموں، علاقوں اور طبقوں اور مختلف زبان والوں کو جوڑ جوڑ کر جماعتوں میں بھیجو اور اصول کی پابندی کراؤ۔ پھر انشاءاللہ امت بننے والا کام ہوگا اور شیطان اور نفس خدا نے چاہا تو کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔

دو دن نظام الدّین میں

اپر انڈیا اکسپریس اپنی پوری رفتار سے فرّاٹے بھرتی چلی جارہی تھی۔ راستہ میں دونوں طرف سرسبز کھیتوں اور ڈبڈبائے ہوئے نالوں اور ندیوں کا مسلسل منظر نگاہوں کو اپنی طرف کھینچ رہا تھا۔ مگر ٹرین کے لیے ان خوشنما مناظر میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پستی اور بلندی، خشکی اور پانی اس کی رفتار میں کوئی فرق پیدا نہیں کرتے تھے۔ راستہ میں چھوٹے چھوٹے اسٹیشن آتے مگر وہ ان کو چھوڑتی ہوئی اس طرح بھاگی چلی جارہی تھی گویا اسے کہیں ٹھہرنا نہیں ہے۔

دل نے کہا۔ حق کے مسافر کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ دنیا کے خوشنما مناظر اس کو لبھانے کے لیے سامنے آتے ہیں مگر وہ ان سے آنکھیں بند کرلیتا ہے۔ سائے اور اقامت گاہیں اس کو ٹھہرنے اور آرام کرنے کی دعوت دیتے ہیں مگر وہ اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے مقاصد اس کا راستہ روکتے ہیں، مگر وہ ہر ایک سے دامن بچاتا ہوا بڑھتا چلا جاتا ہے۔ زندگی کے نشیب و فراز اس سے ٹکراتے ہیں مگر اس کے عزم اور اس کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آتا۔ کیونکہ حق کا مسافر ایک بے مقصد دنیا میں بھٹکے ہوئے شخص کے مانند نہیں ہے۔ بلکہ اس کے ذہن میں ایک مقصد ہے اور اس کے سامنے ایک معلوم منزل ہے۔ پھر وہ کیسے کہیں اور رُک سکتا ہے۔ کیسے دوسری چیز میں اُلجھ کر اپنا وقت ضائع کرنے کو پسند کرسکتا ہے۔ اسے تو بڑھنا ہے اور بڑھتے ہی رہنا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے مقصد کو پالے۔ یہاں تک کہ وہ اپنی منزل پر پہونچ جائے۔

یہ ماہ اگست ۱۹۶۶ء کی چودہ تاریخ تھی۔ دن کے دس بجے ہم اپنی منزل پر پہونچے۔ دہلی کے مشرقی کنارے پر خواجہ نظام الدین اولیاء کے مزار سے تھوڑے فاصلے پر "بنگلہ والی مسجد" ہماری منزل تھی جو سالہاسال سے تبلیغ و اصلاح کی مشہور تحریک کا مرکز ہے۔ کسی وقت یہ جگہ شہر سے الگ

تھلگ بالکل سنسان حالت میں تھی۔ مگر اب وہ "بستی نظام الدّین" کے نام سے مشہور ہے جہاں اچھی خاصی آبادی ہو چکی ہے۔ اور جو دہلی کارپوریشن کا ایک حصّہ ہے۔ جس وقت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں کام کا آغاز کیا تو یہاں کی سنسان آبادی کی طرح وہ ایک نامانوس اور غیر مقبول آواز تھی۔ مگر آج ایک عالم اس دعوت کی طرف متوجہ ہے۔ جس طرح یہ آبادی اب ایک پُررونق شہر میں تبدیل ہو چکی ہے ــــ نظام الدین آج ایک ملک گیر بلکہ عالم گیر تحریک کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اس کی مثال قلب کی سی ہے۔ جس طرح قلب سے خون چلتا ہے اور سارے جسم میں گھوم کر پھر قلب کی طرف واپس آتا ہے اسی طرح بے شمار انسان یہاں سے نکل نکل کر دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلتے ہیں اور پھر واپس آکر نئی قوت لیتے ہیں اور دوبارہ اپنے تبلیغی سفر کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ یہاں ایک ایسی حرکت کے سرے ملتے ہیں جس کا آغاز تو ہے مگر جس کا کوئی اختتام نہیں۔

میرے سامنے ایک بوڑھا شخص تھا۔ چہرے پر ہڈیاں نکلی ہوئی، حلیہ سے افلاس اور جہالت نمایاں۔ قدیم طرز کے دو گول شیشے کپڑے اور چمڑے کی مدد سے باندھ کر دونوں کانوں میں اٹکائے گئے تھے یہ اس کی عینک تھی۔ دوسری طرف وہ چہرے اور جسم بھی تھے جن پر مکھیاں پھسلتی ہیں اور جن کے وضع ولباس میں علم و امارت کی شان نمایاں تھی۔ اور یہ سب لوگ یکساں توجہ اور انہماک کے ساتھ مقرر کی تقریر سُن رہے تھے۔ ایسی تقریر جو علمی تعریف کے مطابق نہ تقریر کہی جا سکتی ہے اور نہ وعظ۔ مگر اس کے باوجود اس کے اندر جادو کی سی کشش تھی، اور سارے لوگ بے اختیار اس کی طرف کھنچے چلے جا رہے تھے۔

۱۔ "بنگلہ والی مسجد" کی اس دنیا میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلی چیز جو آدمی کو اپنی طرف کھینچتی ہے وہ یہاں کا مجمع ہے۔ ناظر دیکھتا ہے کہ انسانوں کا ایک ہجوم ہے جو پروانہ وار امنڈا چلا آرہا ہے۔ اس میں جاہل بھی ہیں اور عالم بھی۔ تہمد پوش بھی ہیں اور پتلون پوش بھی۔ موٹے بھی ہیں اور دُبلے بھی۔ جوان بھی ہیں اور بوڑھے بھی۔ قریب کے بھی ہیں اور دور کے بھی۔ حتیٰ کہ ملک کے باہر دوسرے دوسرے جغرافی علاقوں کے بھی۔ جن کی صورتیں الگ، جن کے لباس مختلف، جن کی زبانیں ہم سے جدا۔ اور یہ سارے لوگ اس طرح آرہے ہیں اور جا رہے ہیں جیسے کوئی سیلاب ہے جو بہہ رہا ہے اور

کسی طرح ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔

"آخر وہ کیا چیز ہے جو ان بے شمار انسانوں کو اس بستی کی طرف کھینچ رہی ہے" یہ سب سے پہلا سوال ہے جو نووارد کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے۔ مگر قبل اس کے کہ وہ کسی سے پوچھ کر اس کا جواب معلوم کرے وہ خود ہی اس سوال کا جواب پالیتا ہے۔ جب وہ یہاں کے پروگراموں میں شریک ہوتا ہے، یہاں کی باتوں کو سُنتا ہے، یہاں کی بلبلا دینے والی دعاؤں پر آمین کہتا ہے، تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ ایک غیر معمولی تسخیری قوت ہے جو اس کے دل و دماغ پر قبضہ کیے جا رہی ہے۔ کوئی روحانی مقناطیس ہے جو بے پناہ کشش سے اس کو اپنی طرف کھینچے چلا جا رہا ہے۔ وہ خود اپنے ذاتی تجربے میں اس سوال کا جواب پالیتا ہے کہ ملک کے اندر اور ملک کے باہر سے اتنے سارے لوگ کیوں پروانوں کی طرح اس بستی پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں۔ کیوں یہ مسجد بے شمار انسانوں کی نقل و حرکت کا مرکز بن گئی ہے۔

مسجد کے اوپر کے ایک کمرے میں میں سو رہا تھا کہ دور سے آنے والی الارم کی آواز نے مجھے جگا دیا۔ یہ رات کے ساڑھے تین بجے تھے۔ اب تبلیغ کے اس مرکز میں سرگرمیوں کا وقت شروع ہو چکا تھا۔ چاروں طرف انسانوں کی ہلچل نظر آنے لگی۔ سیکڑوں لوگوں نے اٹھ کر وضو کیا اور تہجد کی نماز میں مشغول ہو گئے۔ نماز کے بعد کوئی دعا کر رہا ہے، کوئی ذکر کر رہا ہے، کوئی رو رہا ہے، کوئی تلاوت کر رہا ہے، کوئی اپنی اور امت کی اصلاح کی درخواست لے کر خدا کے حضور سجدہ میں پڑا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ "اللہ اکبر اللہ اکبر" کی آواز کے ساتھ مؤذن نے اعلان کیا کہ فجر کا وقت شروع ہو گیا ہے۔ اب فجر کی سنتیں پڑھی گئیں اور سوا پانچ بجے فجر کی نماز ہوئی۔ تکبیر ہوئی تو تقریباً تین سو آدمی بیک وقت جماعت کے لیے کھڑے ہو گئے۔

"نماز کے فوراً بعد بیان ہوگا، سب لوگ یہیں مسجد میں ٹھہرے رہیں" جماعت سے فراغت کے بعد ایک شخص نے اعلان کیا۔ اب تقریر شروع ہوئی۔ موضوع تھا دین اور دنیا کا تعلق۔ سادہ الفاظ، بے تکلف انداز، قریب کی آسان مثالیں، دینی جذبہ اُبھارنے والی نفسیاتی باتیں۔ جگہ جگہ جان ڈالنے والے واقعات سے استدلال۔ نہ تقریر کی خطابت، نہ وعظ کی اُکتاہٹ —— یہ تھا تقریر کا خلاصہ صبح کے جھٹپٹے میں تقریر شروع ہوئی اور اتنی دیر تک جاری رہی کہ سورج اوپر آگیا۔ مگر تقریر میں اتنی جاذبیت تھی کہ شاید ہی کوئی شخص درمیان میں اٹھا ہو۔ تقریر کے بعد باہر نکلنے کی دعوت دی گئی۔

لوگوں نے اپنے نام لکھوائے اور ساڑھے آٹھ بجے یہ پروگرام ختم ہوا۔

اس کے بعد اجتماعی ناشتہ ہوا۔ ناشتہ کے بعد پھر تعلیم و تقریر کی مجلس شروع ہوگئی جس میں اللہ سے تعلق قائم کرنے اور اس پر بھروسہ کرنے کی تلقین تھی۔ آخر میں طویل دعا ہوئی۔ مجلس کے درمیان میں امیر بیٹھ کر دعا کر رہا تھا اور حاضرین رو رو کر آمین کہہ رہے تھے۔ دعا میں انسانی کمزوریوں اور اللہ تعالیٰ کی عظمتوں کو اس طرح نمایاں کیا جارہا تھا اور انسان کی فطرت میں دبے ہوئے جذبات کو اس طرح اُبھارا جارہا تھا کہ دل دہلے پڑ رہے تھے۔ دعا کے بعد جماعتوں کی روانگی کا پروگرام تھا۔ جن لوگوں نے اپنے نام تبلیغی سفروں کے لیے لکھوائے تھے ان کی الگ الگ علاقوں کے اعتبار سے فہرستیں تیار کرلی گئی تھیں۔ ایک شخص کھڑے ہوکر ہر جماعت کے افراد کے نام پکارتا تھا۔ اور لوگ آکر امیر سے مصافحہ کرکے روانہ ہورہے تھے۔ عجیب منظر تھا جو مسجد نبویؐ کے اس منظر کو یاد دلاتا تھا جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ترغیب دے کر مختلف علاقوں کو سرایا روانہ فرمایا کرتے تھے۔ امیر ہر ایک سے مصافحہ کرکے کہتا تھا ——— یغفر اللہ لنا ولکم، میں تم کو خدا کے حوالے کرتا ہوں۔ اور تمہارے لیے خیر کی دعا کرتا ہوں، اللہ قبول فرمائے تم کو بھی، مجھ کو بھی اور پوری امت کو" ایک جماعت میں ایک ایسے شخص نے بھی نام لکھوایا جو ایک پاؤں سے معذور تھا۔ وہ لنگڑاتا ہوا آیا اور لنگڑاتا ہوا واپس گیا ایک اور شخص اپنے چھوٹے بچے (عمر تقریباً ۱۰ سال) کو بھی ساتھ لے جارہا تھا۔ یہ سب مناظر اس قدر پُرکشش تھے کہ مشکل ہی سے کوئی ان سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکتا ہے۔

ساڑھے بارہ بجے یہ پروگرام ختم ہوا۔

دوپہر کے کھانے کے بعد کچھ دیر آرام کے لیے وقفہ دیا گیا۔ تین بجے ظہر کی نماز پڑھی گئی۔ اور نماز کے بعد پھر وہی تعلیم و تبلیغ کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ درمیان میں عصر کی نماز ہوئی۔ پھر مغرب تک مسلسل تقریر، مغرب بعد عشا تک تقریر، عشا کے بعد کھانے کا وقفہ، کھانے کے بعد پھر تقریر اور درس۔ نصف شب میں جاکر یہ سلسلہ ختم ہوا۔

یہ پروگرام جو میں نے لکھا۔ کسی ایک دن کا قصہ نہیں۔ بلکہ یہی یہاں کا روزانہ کا معمول ہے۔ کسی تحریک کے سالانہ اجتماع کے موقع پر اجتماع گاہ میں چند دن جو ہماہمی اور مصروفیت ہوتی ہے وہ یہاں سال بھر جاری رہتی ہے۔ تعلیم، تقریر، درس، بیان، دعا، وضو، نماز، ذکر، تضرع، گریہ وزاری

اسی کے ساتھ خدمت، اخلاق، شرافت، سیکڑوں انسان ہر آن ان مشاغل میں مصروف رہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک ایمانی ہلچل اور ایک اسلامی گرم بازاری ہے جو ہر وقت جاری ہے۔

۲۔ یہ اس دنیا کی سب سے پہلی خصوصیت ہے جو ایک نو وارد یہاں محسوس کرتا ہے۔ اس وقت اسے معلوم ہوتا ہے کہ یہ "مرکز تبلیغ" دوسری جماعتوں اور پارٹیوں کے مراکز سے کس قدر مختلف ہے۔ تمام جماعتیں خواہ وہ دینی ہوں یا غیر دینی، بلا استثنا ان کے مراکز آج ایک "دفتر" میں تبدیل ہو چکے ہیں — جماعتوں اور پارٹیوں کے مرکز میں جاکر کوئی شخص ان کی تحریک کو نہیں پاتا۔ اس کے سامنے بس ایک دفتر ہوتا ہے۔ جس کے مختلف شعبے ہیں۔ کہیں صدر کی تختی لگی ہوئی ہے کہیں سکریٹری کی، کوئی مہمان خانہ کا کمرہ ہے اور کوئی طعام خانہ کا۔ اور ان دفتروں میں جو سرگرمیاں روزانہ ہوتی ہیں وہ کیا ہیں — اخبارات کا مطالعہ، پارٹی کے نقطۂ نظر سے ملکی حالات پر تبصرے، رجسٹروں کی خانہ پُری، رپورٹوں کی تیاری، خط وکتابت، سرکلر کی روانگی، تنظیمی مسائل پر بحثیں، لیڈروں کے استقبال کی تیاریاں، غرض وہی سب کچھ جو عام قسم کے دفتروں میں ہوتا ہے۔ وہی ان جماعتی دفاتر میں بھی روزانہ ہوتا ہے۔

یہ فرق کوئی معمولی فرق نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا فرق ہے جو نظام الدین کی اس بنگلہ والی مسجد کو مدینہ کی قدیم مسجد نبویؐ سے مشابہ کر دیتا ہے۔ آنحضور صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے زمانے میں مسجد نبویؐ اسلامی تحریک کا مرکز تھی۔ مگر یہ مرکز اس قسم کی رسمی کارروائیوں کا دفتر نہیں تھا جیسے آج کل کی جماعتوں کا ہوتا ہے۔ بلکہ یہ خود اسلام اور اسلامی زندگی کا مرکز تھا۔ وہاں نماز کی اقامت، ذکر کی مجلسیں، خدا سے لپٹنا، اپنے دوسرے بھائیوں کی خدمت، قرآن کی تلاوت، سنّت کا چرچا، اسلام کے پھیلانے کی فکریں ہوا کرتی تھیں۔ مسجد نبویؐ میں آکر ایک شخص ویسا ہی محسوس کرتا تھا جیسے سخت سردی یا سخت گرمی کے زمانے میں باہر کی فضا سے چل کر کوئی شخص یکایک ایرکنڈیشنڈ عمارت میں داخل ہو جائے۔ ابتدائی دور کی مسجد نبویؐ میں نہ عمارت کی شان وشوکت تھی، نہ سامانِ آرائش کا ہجوم، البتہ وہاں آدمی اسلام کو دیکھتا تھا، وہاں تعلق باللہ کے مناظر اس کو اپنی طرف کھینچتے تھے۔ وہاں دین کا درد تڑپتا ہوا نظر آتا تھا وہاں قرآن واقعہ بننے کی کوشش کرتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ چنانچہ جو شخص مسجد نبویؐ کے اسلامی ماحول میں داخل ہوتا تھا وہ متاثر ہوئے بغیر باہر نہیں آتا تھا۔

بنگلہ والی مسجد کا یہ ماحول جو چوتھائی صدی سے بھی زیادہ عرصہ سے جاری ہے۔ یہ سنّت نبویؐ کے

ایک ایسے پہلو کا احیاء ہے جس کی نظیر شاید کہیں اور نہیں ملے گی۔ آج دنیا میں اسلامی دفاتر تو اتنے ملیں گے کہ ان کو شمار کرنا مشکل ہے۔ مگر مسجد نبوی کے نمونہ کا اسلامی مرکز کہیں نہیں ملتا۔ اور یہ اتنا بڑا واقعہ ہے کہ تنہا یہی واقعہ کسی کوشش کی طرف نصرتِ الٰہی کو متوجہ کرنے کے لیے کافی ہے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے متعلق سنا کہ وہ ایک بار یہاں آئے اور یہاں کا منظر دیکھا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا ــــ "میں سمجھتا تھا کہ نظام الدین اولیاء ختم ہو گئے۔ مگر میں نے بستی نظام الدین میں آکر دیکھا کہ نظام الدین اولیاء تو ابھی تک زندہ ہیں۔ وہاں جاکر میں دوبارہ مسلمان ہوا ہوں۔ جس کو مسلمان بننا ہے وہ وہاں جائے۔"

۳۔ کام کا یہ انداز اس تحریک کے طریق کار کا اہم ترین جزء ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے تحریک کے آغاز میں جانا پڑے گا۔ مرکز نظام الدین میں میں ایک شخص سے بات کر رہا تھا۔ میرے قریب ایک بزرگ بیٹھے تھے۔ وضع قطع سے دیہاتی اور بالکل اَن پڑھ معلوم ہوتے تھے۔ میرے ساتھی نے ایک موقع پر شہادت کی موت کا ذکر کیا۔ اسی درمیان میں خاموش دیہاتی نے نہایت اطمینان اور اعتماد کے ساتھ اس میں اپنے ایک جملے کا اضافہ کیا ــــ "اور شہادت بھی وہ جو دعوت کی راہ میں پیش آئے۔" اس نے کہا۔ اس کے ایک جملہ سے اندازہ ہوا کہ وہ خواہ جاہل ہو مگر صاحب معرفت ہے۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ "ایک میواتی بزرگ" ہیں جو ۱۸ سال کی عمر میں مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ان کی دعوت میں شریک ہوئے تھے، اور جب سے اب تک اسی کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔

یہ میواتی بزرگ ادھیڑ عمر کے بھاری بھر کم آدمی ہیں۔ سانولے رنگ کے چہرہ پر پرشکوہ داڑھی کے ساتھ جب وہ سادگی اور اعتماد کے الفاظ بکھیر رہے تھے تو مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں قرن اول کی کسی ہستی سے مخاطب ہوں۔ ایک اَن پڑھ شخص کے آگے میرے سارے الفاظ اور میرا تمام علم گم ہو گیا تھا اور میں اس طرح ہمہ تن گوش ہو کر ان کی باتیں سن رہا تھا جیسے کوئی سعادت مند شاگرد اپنے شفیق استاد کے درس کو سنتا ہے۔ مگر افسوس کہ ایک اتفاقی سبب سے یہ گفتگو مکمل نہ ہو سکی اور ہم دونوں قبل از وقت ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔

یہاں مجھے ان کی صرف ایک بات کا ذکر کرنا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ۸۰ میل چوڑے اور ۸۰ میل لمبے

میوات کے علاقہ میں مسلمانوں کی آبادی تھی۔ مگر عالم یہ تھا کہ گوبر اور پتھر پوجتے تھے۔ سید سالار غازی کے علم کا سالانہ مظاہرہ ان کے نزدیک سب سے بڑا کام تھا۔ عمل سے لے کر وضع قطع تک کہیں اسلامیت نہیں تھی۔ ان کی اصلاح کے لیے مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے میوات کے علاقے میں مکاتب کھولے۔ ان مکاتب کو قائم کرنے میں سخت دقتیں پیش آئیں، کیونکہ جاہل میواتی اپنے بچے اس میں دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وہ کہتے کہ ہمارا بچہ کھیت اور مویشی کے کام دیکھے گا، پڑھ کر کیا کرے گا۔ غرض بڑی مشکلوں سے مدرسہ جاری ہوا۔ مگر جب لڑکے وہاں سے پڑھ کر نکلے تو اخلاقی اور دینی اعتبار سے وہ بھی ویسے ہی بن گئے جیسی ان کی آبادی تھی۔ حتیٰ کہ چوروں اور ڈاکوؤں کی بستی سے آنے والے لڑکے پڑھنے کے بعد خود بھی چور اور ڈاکو بن گئے۔ اس وقت میوات کے رہنے والے مسلمان اس قدر اجڈ تھے کہ ایک بار مولانا الیاس صاحب ایک شخص کے اوپر تبلیغ کر رہے تھے۔ میواتی ان کی تبلیغ سے اس قدر خفا ہوا کہ انہیں ایک گھونسہ رسید کر دیا۔ مولانا دبلے پتلے کمزور آدمی، میواتی کے گھونسے کی تاب نہ لا کر گر پڑے اور کچھ دیر غشی کی سی حالت میں پڑے رہے۔ جب ہوش آیا تو اٹھ کر میواتی کا دامن پکڑ لیا اور کہا :-

"تم اپنا کام کر چکے، اب میری بات سنو"

یہ سن کر میواتی کا عجیب حال ہوا۔ وہ خوف سے کانپنے لگا۔ اس نے کہا ——— مولوی، مجھے معاف کر دو، ورنہ میری بخشش نہیں ہو گی"

غرض مکاتب کے ناکام تجربہ کا مولانا الیاس صاحب پر سخت اثر ہوا۔ وہ درد و کرب سے تڑپتے اور کہتے "ہائے اللہ میں کیا کروں" یہاں تک کہ ان پر کھلا کہ موجودہ ماحول میں تعلیم و تبلیغ کا کچھ اثر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ——" استاد لفظ پڑھاوے، تربیت دے ماحول" میواتی نے اپنے سادہ الفاظ میں کہا۔ آج کا ماحول بالکل بگڑ چکا ہے، اور جب آدمی ماحول کے اندر ہوتا ہے تو وہ ہر وقت اس کو اپنی طرف کھینچتا رہتا ہے، ایک طرف کان میں تبلیغ کی آواز جاتی ہے اور عین اسی کے ساتھ ماحول کی آواز بھی داخل ہوتی رہتی ہے، اس لیے تعلیم و تبلیغ کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔

پھر ماحول کہاں سے آئے۔ ظاہر ہے کہ موجودہ ماحول پر تو ہمیں قدرت نہیں کہ بٹن دبا کر اس کو بدل دیں۔ اس کا حل یہ ہے کہ مسجدوں کے اندر چھوٹے چھوٹے ماحول بنائے جائیں جن میں ایک مدت تک کے لیے وہی باتیں چلائی جائیں جو ہم پوری سوسائٹی میں چاہتے ہیں، یعنی ذکر، نماز، دعا، تلاوت، خدمت

اور توجہ الی اللہ کا ماحول ۔ چھوٹے سے دائرہ میں ایسی فضا بنائی جائے کہ وہاں اس کے سوا کوئی اور چیز نہ ہو۔ اس کے بعد لوگوں کو ان کے ماحول سے کاٹ کر اس طرح کے ماحول میں لایا جایا جائے اور وہاں ایک مقرر مدت تک رکھ کر ان کو ایمان و اسلام کی باتیں بتائی جائیں ۔

تبلیغی طریق کار کا خاص فلسفہ یہ ہے کہ لوگوں کو اگر ان کی کھیتیوں میں ، ان کی ملازمتوں میں ان کی تجارتوں میں اور ان کی دنیادی مشغولیتوں میں سمجھانے کی کوشش کروگے تو وہ سمجھ نہیں سکتے ، اس لیے انہیں ان کے مشاغل سے نکال کر مسجد میں لاؤ اور مسجد کے اندر ایک اسلامی فضا بنا کر ان کے اوپر اسلام کی تبلیغ کرو۔ اس وقت ان کا ذہن بالکل خالی ہوگا اس لیے وہ بات کو فوراً سمجھ جائیں گے۔ بستی نظام الدین میں بنگلہ والی مسجد اسی طریق کار کا ایک مستقل عملی مرکز ہے جہاں ہر وقت اسلامی اور تبلیغی ماحول رہتا ہے ۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں ـــــ وہاں ہر آن بس ایک ہی چیز کا چرچا ہے اور وہ یہ کہ خدا سے تعلق جوڑو۔ کیونکہ خدا ہی سے سب کچھ ہوتا ہے ۔ کسی اور چیز سے کچھ نہیں ہوتا۔

متحرک تربیتی کیمپ

تبلیغی کارکنوں کا ہر جگہ یہی کام ہے کہ وہ سفر و حضر میں اسی طرح کے ماحول وقتی طور پر بنائیں جماعتی وفود جو کثیر تعداد میں روزانہ نکلتے رہتے ہیں وہ جب کسی مقام پر پہونچتے ہیں تو ان کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ مقامی طور پر گشت کرکے لوگوں کو مسجد میں آنے کی دعوت دیں ۔ پھر مسجد میں جمع کرکے انہیں نماز پڑھوائی جائے ، تلاوت کرائی جائے ، سیرت پاک اور صحابۂ کرام کے واقعات سنائے جائیں ، دعائیں یاد کرائی جائیں ۔ اعمالِ صالحہ کے فضائل بیان کیے جائیں اور ان کی دینی ذمہ داریاں یاد دلائی جائیں۔ انہیں دعا اور عبادت میں مشغول کیا جائے ۔ اس فضا میں کچھ وقت گزارنے کے بعد جب ان کے دل نرم ہو جائیں تو انہیں چلّہ پورا کرنے کی دعوت دی جائے ۔ چلّہ کے لفظ سے بعض لوگوں کو توحش ہوگا۔ حالانکہ چلّہ دراصل مسجد کی اس چند گھنٹہ کی دینی زندگی کی گویا توسیع ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ چالیس دن تک اپنے دنیوی مشاغل کو چھوڑ کر مسجدوں میں زندگی گزارنا۔ گشت کرکے دوسرے مسلمانوں تک پہونچنا اور ان کو اسلامی زندگی کی طرف بلانا ، اسلامی فضا میں ایک عرصہ تک رہ کر دین کو اس حد تک سیکھ لینا اور پکڑ لینا کہ آدمی پختہ ہو جائے ۔ اور جب دوبارہ اپنے ماحول میں واپس آئے تو اس کا ارادہ اور شعور اس حد تک بیدار ہو چکا ہو کہ آئندہ اسلامی طرز پر زندگی گزار سکے ۔ گویا چلّہ ایک قسم کا متحرک تربیتی کیمپ ہے ۔ یہ

ایک سراپا عمل ہے نہ کہ دھیان گیان قسم کی کوئی چیز۔

یہ طریق کار جو مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ پر کھلا تھا۔ اس کے حیرت انگیز نتائج برآمد ہوئے ہیں، لوگ جو نہایت غلط قسم کی زندگی میں پڑے ہوئے تھے انہوں نے اس سے متاثر ہو کر اپنی زندگیاں بدل ڈالیں۔ ہزاروں ایسے لوگ جو اجتماع اور چلّہ اور گشت کا مذاق اڑاتے تھے جب ان کو ان کے ماحول سے نکال کر دینی فضا میں رکھا گیا اور وہاں ان کے اوپر تبلیغ کی گئی تو وہ اس کے فریفتہ ہو گئے۔ داڑھی کے بغیر نکلے اور داڑھی والے ہو کر لوٹے، سوٹ، ٹائی میں نکلے اور واپس آئے تو ان کا لباس کرتا پائجامہ ہو چکا تھا۔ بے نمازی، زکوٰۃ نہ دینے والے، لڑائی جھگڑا کرنے والے، اور بدکاریوں میں لت پت نکلے اور واپسی اس حالت میں ہوئی کہ یہ پہچاننا مشکل ہو گیا کہ یہ وہی شخص ہے۔ حتیٰ کہ ایسی بھی مثالیں ہیں کہ شراب کی بوتلیں ساتھ لے کر نکالا گیا کیونکہ انہیں اصرار تھا کہ ہم شراب کو چھوڑ نہیں سکتے، مگر شراب کے ماحول کے بجائے دینی ماحول میں شب و روز گزارنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود اپنے ہاتھ سے انہوں نے شراب کی بوتلیں توڑ ڈالیں اور تائب ہو کر مسلمان کی سی زندگی گزارنے لگے۔ ایک کارکن نے بتایا کہ افریقہ میں جب پہلی جماعت گئی تو تبلیغ کے لوگ کرتا پائجامہ میں تھے اور وہاں کے جن لوگوں کو انہوں نے کہہ سن کر اپنے ساتھ گشت کے لیے تیار کیا تھا وہ کوٹ پتلون میں، بعد کو یہ لوگ متاثر ہوئے اور جماعت کے ساتھ نکل کر ہندستان آئے مگر اس وقت ان کا حلیہ اور وضع قطع اتنی بدل چکی تھی کہ پاسپورٹ پر پہلے کی تصویر سے جب سرحد کے افسروں نے ان کا حلیہ ملایا تو وہ کہنے لگے یہ پاسپورٹ تمہارا ہے یا کسی اور کا۔ یہ تو کوٹ اور ٹائی کی تصویر ہے اور تم لوگ دوسرا لباس پہنے ہوئے ہو۔

۴۔ تبلیغ کے اس کام کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کی عمر پچاس برس سے زیادہ ہو گئی اور اس دوران میں اس کے رہنماؤں میں بار بار تبدیلی ہوئی مگر اس کے باوجود اس کا کام برابر بڑھ رہا ہے۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جو جدید تاریخ میں کسی بھی دینی یا غیر دینی جماعت کو حاصل نہیں۔

موجودہ جماعتوں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ابتدا میں تو اس نے انسانوں کو متاثر کرنے کا کام کیا۔ اور بہت سے اچھے اچھے ذہنوں کو کھینچنے میں کامیاب ہوئی۔ مگر کچھ ہی دن گزرنے کے بعد اس کا یہ کام رک گیا۔ جو لوگ شروع میں آ گئے تھے بس انہیں پر جماعت محدود ہو کر رہ گئی۔ کسی جدید تحریک کی تاریخ یہ نہیں بتاتی کہ بعد کے مرحلے میں اس کے اندر ذہنی اضافہ کا وہ کام جاری رہا جو ابتدائی مرحلہ میں انجام پایا

تھا۔ اگرچہ تحریکیں دوسرے مرحلے میں پہونچنے کے بعد بھی زندہ رہتی ہیں اور ایک لحاظ سے ان میں اضافہ بھی نظر آتا ہے۔ مگر یہ اضافہ اس نوعیت کا نہیں ہوتا جس نوعیت کا پہلے دور میں ہوا تھا۔ بعد کے مرحلہ میں ہر تحریک اس طرح نظر آئے گی کہ اس کے افراد بے روح ہو چکے ہیں۔ کاروباری نوعیت کی چیزوں میں تو بہت اضافہ ہو رہا ہے مگر مقصدی نوعیت کی چیزوں میں کوئی اضافہ نہیں۔ دور سے موافقت یا ہمدردی ظاہر کرنے والے بڑھ رہے ہیں اور وہ بھی اس اعلیٰ مقصد کی خاطر نہیں جو شروع میں اختیار کیا گیا تھا، بلکہ ان کمتر درجہ کے نعروں کی بنیاد پر جن کو تحریک نے اپنے گرتے ہوئے ڈھانچہ کو سنبھالنے کے لیے بعد میں اختیار کیا تھا۔

ان مثالوں کے اندر تبلیغی تحریک کی یہ ایک منفرد خصوصیت ہے کہ آج بھی اس کے اندر انسانوں کے لیے اپیل ہے۔ بلکہ پہلے سے زیادہ ہے۔ یہ لوگ نہایت دلچسپی کے ساتھ اس کے پروگراموں میں شریک ہوتے ہیں۔ نئے نئے افراد کثرت سے اس کی دعوت سے متاثر ہو رہے ہیں۔ زندگیوں میں تغیر کا کام پہلے سے بھی زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ جاری ہے۔ نئے نئے طبقات میں دعوت پھیل رہی ہے اور یہ پھیلنا اس مفہوم میں نہیں ہے کہ کسی سستے اور جذباتی اشو پر اتفاق کرنے والے بڑھ رہے ہیں۔ بلکہ عین اسی ٹھوس اور گہرے اسلامی مفہوم میں ہے جس مفہوم میں اس کے داعیٔ اول نے اپنے دعوتی کام کا آغاز کیا تھا۔

اس کی وجہ جو میں سمجھ سکا ہوں وہ غالباً یہ ہے کہ عام طور پر جماعتیں یا پارٹیاں اپنے ماحول کی پیداوار ہوتی ہیں۔ کسی خاص حالات یا زمانے کے اندر وقت کے ذوق کے مطابق ایک تحریک اٹھتی ہے۔ اس طرح کی تحریکیں اگرچہ عام طور پر دائمی نوعیت کی اصطلاحیں استعمال کرتی ہیں اور اپنی فکر کا سرا ابدی حقائق سے ملاتی ہیں۔ مگر حقیقۃً یہ ایک زمانی چیز ہوتی ہے اور اگر اس کے اندر ابدی پیغام کی آمیزش ہو جب بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے وہ ابدی پیغام کا صرف وقتی اڈیشن ہوتا ہے۔ اس کے برعکس تبلیغ کا یہ کام فطرت کے دائمی تقاضوں کی تکمیل ہے۔ فطرت کے وہ تقاضے جو اس کے خالق نے اول روز سے اس کے اندر رکھ دیے ہیں اور جو حالات اور زمانہ سے الگ اپنا مستقل وجود رکھتے ہیں، بس یہی تقاضے اس تحریکِ تبلیغ کا موضوع ہیں۔ دین کی ابدی صداقتوں کے سوا اس تحریک کو اور کسی چیز سے کوئی دلچسپی نہیں۔

اگر اس تشریح کو صحیح مان لیا جائے تو اس میں ہمیں اس کا جواب مل جاتا ہے کہ تبلیغ اور دوسری جماعتوں میں یہ فرق کیوں پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسری جماعتوں کی بنیاد وقتی حالات پر ہے اور تبلیغ کی بنیاد دائمی قدروں پر۔ دوسری تحریکوں میں جو چیز اپیل پیدا کرنے کا سبب بنتی ہے وہ زیادہ تر

باہر کا ماحول ہے اس کے برعکس "تبلیغ" میں جو چیز اپیل پیدا کرنے والی ہوتی ہے وہ خود انسان کی وہ فطرت ہے جو کبھی بدلتی نہیں، خارجی حالات تغیر پذیر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب تک یہ حالات رہتے ہیں اور انسانی ذہن ان کے مطابق سوچتا ہے، اس وقت تک ان کی بنیاد پر پیدا ہونے والی تحریکوں میں لوگوں کے لیے اپیل رہتی ہے اور وہ اس کی طرف کھنچتے ہیں مگر جب حالات بدل جاتے ہیں تو یہ اپیل بھی ختم ہو جاتی ہے اور اس کے بعد اپنے وقت کے حالات کی طرح یہ تحریک بھی محض ایک تاریخی چیز ہو کر رہ جاتی ہے اس کے برعکس تبلیغ کا یہ کام چونکہ انسان کی دائمی فطرت کے اوپر قائم ہے اس لیے اس کی اپیل کبھی ختم نہیں ہوتی۔ جب تک یہ کام اخلاص کے ساتھ جاری رہے گا اس کے اندر اپیل بھی باقی رہے گی خواہ زمانہ کتنا ہی کیوں نہ بدل جائے۔

زمانی تحریکیں زمانہ ختم ہونے کے بعد لازماً معدوم نہیں ہو جاتیں، وہ اکثر اس کے بعد بھی باقی رہتی ہیں، مگر بعد کے زمانے میں ان کی حیثیت تحریک سے زیادہ فرقہ کی ہو جاتی ہے۔ وہ ایک لگابندھا گروہ ہوتا ہے جو محض گروہی تعصب کے سہارے اپنا وجود باقی رکھتا ہے جب کہ تحریک کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر شعور ہو اور اسی کے ساتھ وہ ارتقا پذیر بھی ہو۔ تحریک سے جب اس کا ابتدائی شعور رخصت ہو جائے اور جب نئے افراد کا اضافہ نہ ہو رہا ہو تو اس کے لیے تحریک کے بجائے فرقہ کا نام زیادہ صحیح ہوگا۔ اس کے برعکس وہ تحریک جو دائمی قدروں کی بنیاد پر اٹھی ہو اس میں ہمیشہ شعور اور ارتقا کی صلاحیت باقی رہتی ہے۔ زمانہ اس کو ختم نہیں کرتا۔ اور اگر کارکنوں کی غفلت سے کبھی وہ سست پڑ جائے تو دوبارہ اسے زندہ کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ نظام الدین میں ایک شخص نے لپک کر مجھے اس طرح سلام کیا جیسے وہ میرا پرانا شناسا ہو۔ میں نے دیکھا تو خوبصورت ڈاڑھی کے ساتھ ایک نوجوان چہرہ مسکرا رہا تھا۔ تعارف کے بعد میں نے پہچانا کہ یہ وہی شخص ہے جن سے تعلیم کے زمانے میں ان کے سرپرستوں کو شکایت تھی۔ ان کے بڑے بھائی نے یہ کیا کہ علی گڑھ کی تعلیم ختم کرنے کے بعد انہیں اگلی زندگی کے آغاز سے پہلے تبلیغی جماعت کے ساتھ ایک چلّہ میں بھیج دیا۔ چالیس دن جماعتوں میں رہنے کے اس پروگرام میں اب صرف چند دن باقی تھے اور اس مدت میں وہ اچھے خاصے "مسلمان" بن چکے تھے۔

نظام الدین کے اس سفر سے واپسی کے فوراً بعد مجھے چند ہفتے علی گڑھ میں قیام کرنا پڑا وہاں میں نے دیکھا کہ اسی طرح کے نوجوان سیکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں اور یہ صرف پچھلے چند سالوں کے اندر ہوا ہے

علی گڑھ کے ایک تبلیغی کارکن، جو ایک شعبہ میں لکچرر ہیں، انہوں نے مجھ سے بڑے جوش کے ساتھ کہا —
"ہم تو جب کسی شخص کو نظام الدین لے جاتے ہیں تو اس اعتماد کے ساتھ لے جاتے ہیں کہ وہاں سے وہ خالی نہیں لوٹ سکتا۔" اور میں نے دیکھا کہ واقعات اس کے ان الفاظ کی تائید کر رہے ہیں۔ یونیورسٹی کے طلبہ جو ہمیشہ سے اپنی "نیچریت" اور مغرب زدگی کے لیے مشہور رہے اور جن کی تعلیم بھی ایسی ہے جس کا دین سے کوئی تعلق نہیں، وہ جب نظام الدین جاتے ہیں اور چلّوں میں نکلتے ہیں تو ایسا بدل جاتے ہیں کہ یہ تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ یونیورسٹی کے طالب علم ہیں یا کسی عربی درس گاہ کے۔ بلکہ ان میں کثیر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جن کا اخلاق، جن کی دین داری اور جن کی خدا ترسی اس درجہ کو پہونچ گئی ہے کہ عربی مدارس کے طلبہ بھی ان پر رشک کریں۔ سیکڑوں طلبہ ہیں جن کے اندر خدا ترسی، نماز با جماعت، نوافل خدمتِ خلق، انفاق، دعا، ذمہ داری اور اسلامی وضع قطع کی صفات پیدا ہو گئی ہیں۔ حتیٰ کہ وہاں ایسے مناظر نظر آتے ہیں جو عربی مدارس میں بھی مشکل سے دکھائی دیں گے۔ مثلاً امتحان کے زمانے میں اگر آپ وہاں ہوں تو دیکھیں گے کہ طلبہ جوق درجوق مسجد میں آتے ہیں۔ وضو کر کے دو رکعت صلوٰۃ الحاجۃ پڑھتے ہیں اور اس کے بعد دعا کر کے امتحان ہال میں پرچہ حل کرنے کے لیے جاتے ہیں۔

علی گڑھ میں آج ایک طرح کی دینی فضا معلوم ہوتی ہے جو اس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔ صرف چند سال پہلے کی بات ہے مولانا قاری محمد طیّب صاحب وہاں تقریر کرنے کے لیے تشریف لائے مگر اس وقت تک طلبہ میں دین کے استخفاف کا ایسا ذہن تھا کہ فقرے بازی اور شور و غل کی وجہ سے مولانا اپنی تقریر مکمل نہ کر سکے اور قبل از وقت اٹھ کر چلے گئے۔ اب پچھلے سال وہ دوبارہ یونیورسٹی میں آئے اور ڈھائی تین ہزار کے مجمع میں ان کی تقریر ہوئی۔ مگر سارا مجمع آخر تک بالکل ساکت و صامت بنا رہا — یونیورسٹی کی فضا میں یہ تبدیلی خاص طور پر تبلیغی جماعتوں کی کوششوں کا ثمرہ ہے۔ مسلم یونیورسٹی میں دینیات کا مضمون تمام طلبہ کے لیے لازمی ہے۔ ہر ہاسٹل میں باقاعدہ مسجد اور امام اور موذن کا انتظام ہے، دینی امور کی نگرانی کے لیے ایک مستقل ناظم کا عہدہ ہے اور اس کے علاوہ وہ سب کچھ جس کو یونیورسٹی کا "اسلامی کردار" کہا جاتا ہے۔ مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلم یونیورسٹی کی ساری تاریخ میں کبھی دین کا وہ وقار و احترام پیدا نہیں ہوا جو آج کل وہاں دکھائی دیتا ہے۔ یہ ہے اس تحریک کا نتیجہ جو محدود اور دقیانوسی تحریک سمجھی جاتی ہے اور اس مقام پر جو ہندستان میں مغربیت کا سب سے بڑا گڑھ ہے۔

یہ دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ یہ اس عظیم مسئلہ کا ایک نہایت آسان حل ہے جو ہماری ملت کو عرصہ سے درپیش ہے مگر ہمارے رہنما جس کا حل نکالنے میں ناکام رہے ہیں، یعنی جدید سیکولر تعلیم کے بعد نوجوانوں کو اس کے برے اثرات سے بچانا۔ موجودہ زمانے میں مغربی طرز کی سیکولر تعلیم زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت بن گئی ہے۔ اس تعلیم کا تعلق نہ صرف معاش سے بہت گہرا ہو چکا ہے، بلکہ قرآن کے الفاظ میں وہ وقت کی "قوت" ہے اور دنیا میں باوقار اور مستحکم قومی زندگی کی تعمیر کے لیے اس کا حصول ناگزیر ہے۔ مگر اس تعلیم کے ساتھ کچھ ایسی روایات شامل ہو گئی ہیں اور اس کا ایسا ماحول بن گیا ہے کہ اس تعلیم کے بعد دہریت ورنہ کم از کم بے عملی کا شکار ہو جانا عام ہو گیا ہے۔ پھر جب اس تعلیم کے لازمی نتیجہ کے طور پر خوشحالی اور مادی فراوانی حاصل ہوتی ہے، اس وقت تو یہ سیکولر تعلیم روایتی دیوار قہقہہ کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ جو اس پر چڑھتا ہے وہ دین سے بے تعلق ہو کر بے ساختہ دوسری طرف کو دپڑتا ہے مگر علی گڑھ اور نظام الدین میں کالجوں کے طلبہ کا جو منظر میں نے دیکھا وہ ہماری رہنمائی اس طرف کرتا ہے کہ ہم ایک اور دیوار قہقہہ تعمیر کر سکتے ہیں جب کہ ہمارے نوجوان سیکولر تعلیم کی دیوار پر چڑھیں اور اسلام کی سرزمین میں کود یں۔

نظام الدین اور تبلیغی تحریک کی شکل میں یہ دوسری قسم کی دیوار قہقہہ گویا تعمیر ہو چکی ہے۔ اب ہر شخص جو اپنے بچوں کو جدید تعلیم دلانا چاہتا ہے۔ اسی کے ساتھ اسے یہ بھی طے کر لینا چاہیے کہ وہ اپنے بچہ کو دوران تعلیم میں، چھٹیوں کے زمانے میں کبھی کبھی نظام الدین بھیجتا رہے گا۔ اور ختم تعلیم پر عملی زندگی شروع کرنے سے پہلے اس کو ایک چلّہ بھی کرائے گا۔

تعلیم کے ساتھ یہ اضافہ انشاء اللہ اس کی دینی زندگی کی ضمانت ہو گی۔ بغیر اس کے کہ اس کی تعلیم کو کسی قسم کا نقصان پہونچے۔ میں نے علی گڑھ میں دیکھا کہ تبلیغی نوجوان نہایت دل جمعی کے ساتھ اپنی تعلیمی زندگی میں مشغول رہتے ہیں۔ اور بہتر نمبروں سے پاس ہوتے ہیں۔ اصل میں دین کا جزء جب زندگی میں داخل ہو جاتا ہے تو آدمی کے اندر ایک طرح کی ذہنی تنظیم پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ سنجیدہ اور باشعور ہو جاتا ہے۔ اس کے اوقات بہت سے فضول کاموں سے بچ جاتے ہیں۔ وہ ایک بامقصد نقطۂ نظر کا حامل ہو جاتا ہے۔ ان چیزوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو زیادہ احساس ذمہ داری اور زیادہ باقاعدگی سے گزارنے لگتا ہے۔ اس اضافہ کے ساتھ کہ ہر معاملے میں اسے اللہ کی یاد بھی آتی رہتی ہے۔ اور وہ خدا کی اطاعت کا پابند ہو کر اپنے سارے کام انجام دیتا ہے۔ جو زندگی میں برکت کا نور پیدا کرتا ہے۔

تبلیغی کام عرب ممالک سے لے کر یورپ اور امریکہ تک ہو رہا ہے۔ کثرت سے تبلیغی وفود باہر جاتے ہیں اور باہر سے ہندستان آتے ہیں۔ اور یہاں جماعتوں میں رہ کر پھر واپس جاتے ہیں۔ اکثر بیرونی مقامات پر باقاعدہ تبلیغ کا مرکز ہے اور اس کا نظم قائم ہے۔ اور تبلیغ کے مسلسل حلقے وجود میں آگئے ہیں —— یہ صورت حال ہم کو ایک مزید موقع فراہم کرتی ہے۔ وہ یہ کہ طلبہ کو باہر بھیجنا ہو تو ان کو کسی تبلیغی وفد کے ساتھ بھیجا جائے۔ اور اگر بروقت یہ ممکن نہ ہو تو یہ کوشش کی جائے کہ طالب علم جس ملک میں جائے وہاں حتی الامکان وہ وہاں کے تبلیغی حلقہ سے قریب رہے۔ اس طرح کی سیکڑوں کی مثالیں وجود میں آچکی ہیں اور اس طریقہ کو اختیار کر کے نوجوانوں کے بیرونی تعلیمی سفر کو بڑی حد تک خطرات سے محفوظ کیا جا سکتا ہے۔

آج مسلم قوم سیکولر تعلیم کے میدان میں پوری طرح کود پڑی ہے۔ ہمارے تمام بہترین نوجوان سیکولر اداروں میں تعلیم پا رہے ہیں۔ اگر اس کے ساتھ مندرجہ بالا پروگرام کو بھی شامل کر لیا جائے تو تعلیم یا آیندہ معاشی مستقبل میں کسی قسم کا نقصان کیے بغیر ایک عظیم فائدہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یعنی ہمارے ذہنوں کا نہ صرف ضائع ہونے سے بچنا بلکہ اپنی زندگی کی تعمیر کے ساتھ ملک کے اندر اور ملک کے باہر تبلیغ دین کا زبردست ذریعہ بن جانا۔ اگر اس پر عمل درآمد ہو تو انشاء اللہ وہی واقعہ دوبارہ ظہور میں آسکتا ہے جو عرب کے مسلمان تاجروں کے دنیا بھر میں پھیلنے سے ہوا تھا۔

۶۔ تبلیغ کے اس کام میں زیادہ تر شخصی طور پر بات پہونچانے پر بھروسہ کیا جا رہا ہے۔ یعنی گفتگو، تقریر، ملاقاتوں اور سفروں کے ذریعے براہ راست طور سے اپنے خیالات دوسروں کو منتقل کرنا۔ اس طریقہ میں پریس کا حصہ صرف اس قدر ہے کہ فضائل اعمال اور واقعاتِ صحابہ کی کچھ کتابیں لکھ کر چھپوائی گئی ہیں۔ جو تعلیم کے حلقوں میں پڑھ کر سنانے کے لیے استعمال ہوتی ہیں اور جن سے کارکنوں کو اپنی تبلیغ کے لیے مواد ملتا ہے۔ جب کہ حقیقۃً پریس کے جدید تصور کے مطابق یہ صفر کے برابر ہے۔ تبلیغ کی طرف سے کبھی کوئی رپورٹ شایع نہیں کی جاتی، حالانکہ رپورٹ کے لیے ان کے یہاں اتنا زیادہ اور کبھی ختم نہ ہونے والا مواد ہے کہ شاید ہی کسی جماعت کے پاس اتنا مواد ہو۔ ریلیف ورک اور ملی خدمات کے سلسلے میں بھی ان کے یہاں کہنے کی باتوں کی کمی نہیں۔ مگر کبھی اس قسم کی کوئی چیز اخباروں میں دیکھی نہیں گئی ہر سال اتنے بڑے بڑے اجتماعات ہوتے ہیں کہ بلا مبالغہ ہندستان یا پاکستان میں کسی بھی دینی

جماعت کا اتنا بڑا اجتماع نہیں ہوتا، مگران کے لیے ایک بھی اشتہار یا ہینڈ بل کبھی شائع کیا گیا اور نہ لاؤڈ اسپیکر سے اعلان کیا گیا۔ مستقل طور پر ہزاروں انسان تبلیغ کے کام میں شب و روز متحرک رہتے ہیں، مگر ان لوگوں کو جمع کرنے، انہیں متحرک کرنے اور انہیں ہدایات دینے کے لیے کوئی رسالہ یا اخبار اس کی طرف سے جاری نہیں کیا گیا۔ اس بارے میں تبلیغ کے لوگ اس قدر شدید ہیں کہ بعض بزرگوں نے اپنے طور پر تبلیغ کے کارکنوں کو لٹریچر فراہم کرنے کے لیے کتابیں لکھیں مگر وہ تبلیغ کے حلقہ میں پھیل نہ سکیں، حتیٰ کہ مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ ایک اجتماع کے موقع پر ایک بار مقامی اخبار نے اپنے طور پر اجتماع کی خبر شائع کردی تو اڈیٹر سے مل کر اس کی شکایت کی گئی۔

یہ شدت بہت سے لوگوں کو پسند نہیں آئے گی۔ مگر اس شدت نے تبلیغ کے اس کام میں ایک خاص قدر پیدا کردی ہے جو اس وقت کسی بھی تحریک میں موجود نہیں ہے اور وہ ہے تاثیر کی قوت یہ ایک واقعہ ہے کہ آدمی جب بذات خود اپنے عقیدہ کی تبلیغ کررہا ہو تو اس کی شخصیت کا پورا زور اس کی تبلیغ کے اندر آجاتا ہے۔ اس کے الفاظ میں اس کے کردار کی شیرینی، اس کے لہجے میں اس کے قلب کا سوز و گداز، اس کے انداز میں اس کے یقین کی جھلک اور اس کے خیالات میں ایک جیتی جاگتی زندگی کا مجسم وزن شامل ہوجاتا ہے، نیز اگر یہ گفتگو ماحول کے اندر ہورہی ہو تو ماحول اس کے وزن کے اضافہ میں مزید شریک ہوجاتا ہے، ریڈیو سے کمنٹری سننے اور کرکٹ میچ کے سامنے موجود ہونے میں جو فرق ہے، وہی فرق مزید شدت کے ساتھ زبانی تبلیغ اور کتابی تبلیغ میں پایا جاتا ہے۔

اس کے علاوہ زبانی تبلیغ میں اور بھی بہت سے فائدے ہیں۔ مثلاً اگر دوران تبلیغ میں ضرورت محسوس ہو تو طریق تبلیغ میں بر وقت تبدیلی کی جاسکتی ہے جب کہ کتاب یا رسالہ یہ کام انجام نہیں دے سکتا۔ نظام الدین کی ایک تقریر میں یہ واقعہ بتایا گیا کہ ایک جگہ مداری بندر نچا رہا تھا، تبلیغ کے لوگوں کو خیال ہوا کہ اس کو نماز پڑھانی چاہیے۔ مدرسہ کے کچھ معلّمین اس پر تبلیغ کے لیے بھیجے گئے مگر وہ ناکام واپس آئے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ نہیں مانتا تو ہم کیا کریں۔ ماعلینا الا البلاغ — اس کے بعد تین ایسے آدمی اس کے بعد بھیجے گئے جو ذہنی اور معاشرتی اعتبار سے مداری ہی کی سطح کے تھے۔ انہوں نے کہا — "میاں بندر نچا نچا کر زندگی خراب کر رہے ہو، آخرت میں تم کو خدا کے فرشتے اسی طرح نچائیں گے" یہ جملہ مداری کو لگ گیا۔ تھوڑی سی گفتگو کے بعد وہ ان

لوگوں کے ساتھ ہو لیا اور مسجد میں پہونچ کر بندر بندر یا کو باہر باندھا اور خود اندر جاکر نماز پڑھی۔

اسی طرح زبانی مبلّغ کو یہ موقع حاصل رہتا ہے کہ اگر مخاطب بات نہ سمجھ رہا ہو تو بروقت اس کی ایسی عملی وضاحت کر دے کہ اس کے لیے سمجھنا آسان ہو جائے۔ ایک صاحب جو تبلیغ کے سلسلے میں عرب گئے تھے انہوں نے اپنی تقریر میں بتایا کہ عرب علمار کو جب انہوں نے تبلیغی کام میں شرکت کی دعوت دی تو انہوں نے کہا کہ یہ قرآن اترنے کی زمین اور رسول کی بعثت کی جگہ ہے۔ یہاں تو سارے لوگ دین سے واقف ہیں۔ یہاں تبلیغ کی کیا ضرورت۔ اس کے بعد ان سے کہا گیا اچھا ہمارے ساتھ چلئے اور چل کر دیکھئے کہ آپ کے عوام کی کیا حالت ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہیں کے ایک شخص کو ہم نے پکڑا اور اس سے کہا کہ قل اعوذ برب الفلق پڑھ کر سناؤ، تو عرب کے اس مسلمان شہری نے کہا "اعوذ برب الفلق" (قل کے بغیر) یہ کہتے تھے قل اعوذ برب الفلق تو اس کو سن کر عربی کہتا تھا اعوذ برب الفلق اصل میں وہ نہ تو یہ جانتا تھا کہ یہ قرآن کی کوئی سورۃ ہے اور نہ اسے سورہ یاد ہی تھی۔ اس لیے "قل" کو "پڑھ" کے معنیٰ میں لے کر اس کے آگے کے الفاظ "اعوذ برب الفلق" اپنی زبان سے ادا کر دیتا تھا۔ اسی طرح کئی بار ہوا یہاں تک کہ تبلیغی کارکن نے کہا۔ "قل قل اعوذ برب الفلق" تب جاکر اس نے سورۂ فلق کو اپنی زبان سے دہرایا۔ اسی طرح طائف کے کچھ لوگوں سے سورہ فاتحہ پڑھنے کے لیے کہا گیا تو صرف سورہ فاتحہ میں ایک درجن غلطیاں تھیں۔ یہ دیکھ کر عرب کے عالم رو پڑے اور انہوں نے کہا "ہم نہیں جانتے تھے کہ ہمارے عوام علم دین سے اتنے دور ہیں"

پھر زبانی طور پر اور گھوم پھر کر بات پہونچانے کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ مخاطب سے ارتباط اور اختلاط داعی کے ذہن میں نئے نئے مضامین لانے کا سبب بنتا ہے۔ بات کو موثر بنانے کے لیے نئی نئی مثالیں ملتی ہیں اور گفتگو زیادہ سے زیادہ سادہ اور حقیقی ہو کر مخاطب کے ذہن سے قریب ہوتی چلی جاتی ہے جب کہ تصنیف میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ تبلیغ کے لوگوں کی باتوں اور تقریروں میں عام طور پر بڑی سادگی اور بے ساختگی ہوتی ہے اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ انہوں نے تحریر کے بجائے گفتگو اور تقریر کو اپنا ذریعہ بنایا ہے۔

اس طرح کے اور بہت سے فائدے ہیں جو اس طریق تبلیغ سے حاصل ہوتے ہیں۔

۷۔ امیر تبلیغ نے دعا کی تو ان کی دعا میں یہ فقرہ بھی تھا — "خدایا اس نقل وحرکت کو دین کے

تمام شعبوں کو زندہ کرنے کا ذریعہ بنا ۔ یہ فقرہ اس واقعہ کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ کام محض کلمہ و نماز کی تبلیغ کرنے کا نام نہیں ہے ، بلکہ ان کی نگاہ پورے دین پر ہے اور وہ پورے دین کو زندہ کرنا چاہتے ہیں ۔

اس معاملہ میں تبلیغ اور دوسرے لوگوں میں جو فرق ہے وہ اصلاً طریق کار کا فرق ہے نہ کہ اس بات کا فرق کہ دوسرے لوگ کسی چیز کو دین کا جزء سمجھتے ہیں اور یہ حضرات اس کو دین کا جزء نہیں سمجھتے یا اس کے احیار کو اپنی فہرست سے خارج قرار دیے ہوئے ہیں ۔

تبلیغ کو لوگ کلمہ و نماز کی تحریک سمجھتے ہیں ۔ زیادہ صحیح لفظوں میں وہ یقین پیدا کرنے کی تحریک ہے ۔ وہ یقین جس کا دوسرا نام ایمان ہے ۔ غیبی حقائق پر ایمان ، خدا پر ایمان ، چنانچہ مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ علیہ تبلیغ کو " تحریک الایمان " کہا کرتے تھے ۔ ان حضرات کا کہنا ہے کہ دنیا میں جن طریقوں کا چلن ہے اور جن سے بظاہر کام ہوتا ہوا نظر آتا ہے ، وہ نتیجہ پیدا کرنے کے لیے بذات خود مؤثر نہیں ہیں ، بلکہ موثر وہ ذات ہے جو ان شکلوں کے پیچھے کام کر رہی ہے ۔ مگر عام طور سے لوگ شکلوں ہی کو اصل سمجھ لیتے ہیں ۔ ایک مقرر کے الفاظ میں :" کائنات کی شکلوں کو تو نہیں چھوڑنا ہے البتہ کائنات کی شکلوں پر یقین کو چھوڑنا ہے ، وہ اسباب و وسائل کے "اشتغال" کی نفی نہیں کرتے ۔ مگر اسباب و وسائل پر " اتکال " کی نفی کرتے ہیں ۔

ان کی دعوت یہ ہے کہ " خدا سب کچھ کے بغیر سب کچھ کر سکتے ہیں ، سب کچھ خدا کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے کائنات کی ساری شکلوں کے یقین کو دل سے نکالو ، اس کے بعد ہی عمل میں طاقت آئے گی "۔ گویا تبلیغی جماعت اور دوسری جماعتوں میں جو فرق ہے وہ دین کے محدود تصور یا دین کے وسیع تصور کا فرق نہیں ہے بلکہ اس بات کا فرق ہے کہ وہ کون سا میدان ہے جہاں دین کے احیار و اقامت کے لیے محنت کی جائے ۔ بہت سے لوگ پارلیمنٹ ہاؤس یا پریڈ گراؤنڈ یا الیکشن کے موسم اور اس طرح کی دوسری چیزوں کو محنت کا میدان سمجھتے ہیں ۔ اس کے برعکس تبلیغ والوں کے نزدیک خدا کی کارفرمائیوں پر یقین پیدا کرنا اور اس سے نصرت کا طالب ہونا مومن کی محنت کا اصل میدان ہے ۔

خدا پر محنت کرکے آدمی سب کچھ پا لیتا ہے کیونکہ ساری چیزوں کا سرا خدا کے ہاتھ میں ہے اور وہی جس کے لیے چاہتا ہے کسی چیز کا فیصلہ کرتا ہے ۔ " تکوینیات تابع ہیں تشریعیات کے ۔ اگر ہم تشریعی قوانین کے پابند ہوں گے تو تکوینی نظام ہمارے ساتھ معاون ہوگا " قوم سبا نے زراعت پر ، قوم شعیب

نے صنعت و تجارت پر، فرعون نے ملک پر، قارون نے مال پر محنت کی مگر سب ناکام ہوئے۔ صحابہ نے ایمان اور نماز پر محنت کی، ہر چیز کے مالک ہو گئے۔ کامیابی و ناکامی کی بنیاد انسان کے اندر قائم ہوتی ہے، باہر کی شکلوں میں قائم نہیں ہوتی۔" "سعد بن ابی وقاص نے خواب دیکھا کہ پانی کے اوپر چل رہا ہوں۔ اس کے بعد گھوڑا دریا میں ڈال دیا۔ ابوموسیٰ اشعری اور بارہ ہزار لشکر دریا کے پار اتر گئے یہ غیبی نظام پر یقین کا نتیجہ تھا۔ ہم مشاہدہ والے نظام پر یقین رکھتے ہیں۔" یہ یقین جب مومن کے دل میں پیدا ہو جائے تو نہ صرف بازار اور کارخانے اور حکومت اس کے لیے مسخر کر دی جاتی ہیں بلکہ ہوا پر اس کا حکم چلتا ہے (جیسے حضرت عمر کی آواز مدینہ سے جاکر ایران میں نہاوند پہاڑیوں میں سنائی دی) جانور اور صحرا و بیابان اس کے تابع ہو جاتے ہیں۔ (جیساکہ صحابہ نے ایک بار جنگل کے جانوروں کو پکار کر کہا اور وہ جنگل سے نکل گئے) سمندروں اور دریاؤں کو اس کے لیے مسخر کر دیا جاتا ہے جیسا کہ صحابہ کی فوج نے گھوڑے اور گدھوں اور اونٹوں کے ساتھ دریا کو پار کیا تھا)

تبلیغی جماعت کا یہ نظریہ ہے کہ خدا مسبب الاسباب ہے۔ وہی تقدیر بناتا ہے، وہی رزق دیتا ہے، حکومت کا ایتاء اور نزع (عطا کرنا اور چھین لینا) اسی کے اختیار میں ہے، غرض ہر واقعہ جو دنیا میں ہوتا ہے اس کے پیچھے خدا کی ہستی کارفرما ہوتی ہے۔ پھر کسی مقصد کے حصول کے لیے خدا کے سوا اور کہیں محنت کرنا ایسا ہی ہے جیسے کمرہ روشن کرنے کے لیے سوئچ بورڈ پر ہاتھ پہونچانے کے بجائے بلب کو پکڑ کر اس سے منت سماجت کی جائے۔ اب چونکہ پورے دین کا بروئے کار آنا اور اہل ایمان کا غلبہ و سربلندی جن اسباب سے بندھی ہوئی ہے اس کا سرا بھی خدا ہی کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے اس مقصد کے حصول کا بھی یہی طریقہ ہے کہ خدا کو راضی کر کے اس معاملے میں اس کی نصرت کا استحقاق پیدا کیا جائے" حالاتِ عالم اس وقت بدلیں گے جب لوگوں میں دین آئے گا۔ اس کے بغیر حالاتِ عالم بدل نہیں سکتے۔"

۸۔ تبلیغ کے اس کام کو ایک اور موقع (ایڈوانٹج) یہ حاصل ہے کہ اس کی تبلیغ کا تمام تر انحصار وجدانیات پر ہے نہ کہ عقلیات پر۔ دعوت کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک ہے ذہن کی راہ سے مخاطب کے اندر گھسنا، دوسرے وجدان و احساس کی راہ سے گھسنا۔ پہلی صورت میں عقلی اور منطقی طور پر بات کو ثابت کر کے اس کو مخاطب کے لیے قابل قبول بنایا جاتا ہے۔ دوسری صورت میں جذبات

کو ابھار کر مخاطب کو اس طرف لے جانے کی کوشش کی جاتی ہے ۔

جو لوگ فلسفیانہ افکار سے آشنا ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں کہ پہلا راستہ کس قدر نازک اور مشکل ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ خالص عقلی اور منطقی طور پر کسی نقطۂ نظر کو ثابت کرنا بے حد مشکل بلکہ بہت سے لوگوں کے نزدیک ، کم از کم اب تک کے علمی ارتقاء کے مطابق ناممکن ہے ، حتیٰ کہ موجودہ عقلی زمانے میں بھی ۔ اگر اس نوعیت کی کسی تحریک کو کامیابی ہوئی ہے تو وہ اس کے علمی استدلال کی بنا پر نہیں بلکہ زیادہ تر اس بنا پر کہ اس کے ساتھ اتفاق سے جذباتی پہلو بھی شامل تھا ۔ یہاں اشتراکیت ، جمہوریت اور ارتقاء کے نظریات کو مثال میں پیش کیا جا سکتا ہے ۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ اشتراکیت ابھی تک خالص علمی اعتبار سے ثابت شدہ نہیں ۔ جمہوریت پر علمی اعتبار سے ایسے کثیر اعتراضات کئے گئے ہیں کہ اس کے حامی ابھی تک اس کا جواب فراہم نہیں کر سکے ۔ حیاتیاتی ارتقاء کا نظریہ علمی اعتبار سے اپنے اندر اس قدر خلا رکھتا ہے کہ اس کو نظریہ کے بجائے اعتقاد کہنا زیادہ صحیح ہوگا ۔ ان نظریات کی کامیابی کا راز ان کی عقلی و منطقی بنیادوں میں نہیں بلکہ اس جذباتی فضا میں ہے جو اس طرح کے کسی تصور کو قبول کرنے کے لیے پہلے سے آمادہ تھی ۔

اس اضافہ سے میرا مقصود صرف یہ واضح کرنا ہے کہ تبلیغ والوں نے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ عملی طور پر ان لوگوں سے زیادہ مفید اور موثر ہے جو عقل و منطق کی راہ سے دین کا اثبات کرنے میں لگے ہوئے ہیں ۔ خالص عقل کی راہ سے ثابت کرنے کی کوشش دراصل ایک ایسے عنقا کو پکڑنے کی کوشش ہے جو ابھی تک دریافت نہیں ہوئی ۔ مگر دوسری ایک چیز اور ہے جو آج بھی موجود ہے ۔ اور وہ ہے فطرت اور روایت ۔ اور میں مبالغہ نہیں کروں گا اگر میں کہوں کہ آج بھی ۹۹ فیصد لوگوں کی شخصیت حقیقۃً فطرت اور روایت ہی کے تحت بنی ہے ۔

ہمارا عقیدہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے دین فطرت پر پیدا کیا ہے ۔ اور یہ فطرت لازمی طور پر ہر ایک کے ساتھ لگی ہوئی ہے ۔ مگر جو لوگ مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے ہیں ان کے ساتھ فطرت کے علاوہ ایک اور موافق عنصر بھی شامل ہے ، اور وہ ہے روایت ، تاریخی اور نسلی اثرات ، خاندان اور ماحول کی تربیت اور بہت سے لوگوں کے لیے ان کی تعلیم ، کم از کم ابتدائی تعلیم ، آج بھی لاشعور کی سطح پر انہیں مسلمان بنائے ہوئے ہے ، وہ بظاہر خواہ بے دین نظر آتے ہوں ، مگر فطرت اور

روایت نے مل کر ان کا جو اندرونی سانچہ بنایا ہے وہ تقریباً ہر ایک کا اسلامی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تبلیغ کے لوگ جب جذباتی باتیں کرتے ہیں تو سننے والوں کا ذہن جاگ اٹھتا ہے، جب وہ جنت اور جہنم کی تفصیلات بتاتے ہیں تو ان کے دل دہلنے لگتے ہیں، جب وہ دعاؤں کے ذریعہ اندرونی احساسات کو چھیڑتے ہیں تو بڑے بڑے "بے دینوں" کے آنکھ سے بھی آنسو نکل آتے ہیں۔ یہ باتیں خواہ عقل کے اعتبار سے زیادہ طاقت ور نہ ہوں مگر کم از کم اب تک کے انسانوں کے لیے ان کے اندر ایک وجدانی اپیل ہے۔ اس طرح کی آوازوں کے سایے میں جب آدمی کچھ دن زندگی گزارتا ہے تو اس کا شعور زندہ ہو کر اس کی شخصیت پر چھا جاتا ہے اور اس کو دوبارہ "مسلمان" بنا دیتا ہے ـــــ تبلیغ والوں کی کامیابی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ انہوں نے عقلی عنقا کو پکڑنے کی کوشش نہیں کی۔ بلکہ موجودہ جذباتی بنیاد، بظاہر غیر منطقی بنیاد، کو استعمال کیا۔ اور تجربہ بتاتا ہے کہ اس میں وہ پوری طرح کامیاب رہے۔

۹۔ اب گفتگو ایک ایسے مقام پر پہونچ گئی ہے، جہاں ہم اپنی آخری بات کہہ سکتے ہیں۔ "جماعت تبلیغ جو کچھ کر رہی ہے کیا یہی دین کا صحیح اور مکمل کام ہے؟" یہ سوال ہم میں سے اکثر لوگوں کو پریشان کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہم ایک ایسا جواب پا سکتے ہیں جس میں تبلیغ کی بھی پوری اہمیت تسلیم کی گئی ہو اور اسی کے ساتھ ان لوگوں کی ذہنی تسکین بھی اس کے اندر موجود ہو جو تبلیغ کے باہر بھی کچھ کرنے کا کام سمجھتے ہیں۔ مگر ان کو فکری طور پر اس طرح مربوط نہیں کر پاتے کہ دونوں کو ان کی واقعی جگہ دیتے ہوئے دونوں کے تقاضے پورے ہو سکتے ہوں۔

قرآن و سنّت کے مطالعے سے دین کا جو مطلب میں سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ دین کے تقاضے دو قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک تقاضا تو وہ ہے جو دین کی اصل اور اس کی روح ہے ـــ یہ ہے اللہ کی معرفت اس سے خشیت و محبّت کا تعلق، اس کے اوپر اعتماد، اور پھر اس طرح مومن و قانت بن کر خدا کی عبادت اور معاملاتِ زندگی میں اس کی تابعداری۔ دوسرا تقاضا وہ ہے جو مادی دنیا اور دین کے تصادم سے پیدا ہوتا ہے۔ دین کو فکری اور عملی طور پر غالب و سربلند رکھنے کے لیے مختلف صورتیں پیش آتی ہیں اور موقع کے اعتبار سے ہر جگہ مومن کو نمٹنا پڑتا ہے ـــــ کہیں رکانہ سے کشتی لڑنی ہوتی ہے کہیں حسان بن ثابت کو حکم دیا جاتا ہے کہ نظم سنائیں، کہیں وقت کے عقلاء کو مطمئن کرنے کے لیے حجّتِ ابراہیمی ظہور میں آتی ہے، کہیں بدر و حنین کے معرکے پیش آتے ہیں۔ کہیں غیر مسلموں سے معاہدہ کیے

جاتاہے، وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک پہلے تقاضے کا تعلق ہے، وہ دین کی اصل ہے اور دائمی طور پر دین کے مطلوب کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر دوسری چیز کی یہ حیثیت نہیں۔ وہ دین کا اضافی جزء ہے نہ کہ حقیقی۔ حالات جس وقت اس طرح کے کسی تقاضے کو بروئے کار لاچکے ہوں اس وقت تو اضافی جزء بھی عملی طور پر حقیقی جزء کی طرح مطلوب ہوجاتا ہے۔ مگر جب حالات نے اس کی ضرورت نہ پیدا کی ہو، اس وقت مومن کے اوپر اس سلسلے میں کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی۔

اگر اس تشریح کو مان لیا جائے تو میرا خیال ہے کہ ہمارے دینی و ملی کاموں میں وہ ربط اور وہ منصوبہ بندی وجود میں آسکتی ہے جس کے ہم سب لوگ دل سے متمنی ہیں مگر اس کے باوجود وہ ہمارے اندر پیدا نہیں ہوتی۔ جہاں تک تبلیغ کے کام کا تعلق ہے اس کے کارکنوں کو بھی اور دوسرے لوگوں کو بھی اسے یہ حیثیت دینی چاہیے کہ وہ حقیقت دین کو زندہ کرنے کی کوشش ہے۔ یہ بات میں تبلیغ کی اصل دعوت کے اعتبار سے کہہ رہا ہوں نہ کہ اس کے مخصوص طریقِ کار کے اعتبار سے۔ کیونکہ طریق کار خواہ وہ کسی بھی جماعت یا تحریک کا ہو، ہمیشہ اضافی ہوتا ہے، تبلیغی کارکن اپنے کام کو صرف اسی ایک کام تک محدود رکھیں۔ اور دوسری طرف پوری امت حقیقت دین پیدا کرنے کے لیے اس کے اوپر اعتماد کرے۔

مگر جیسا کہ میں نے کہا تبلیغ کی ساری اہمیت تسلیم کرنے کے بعد بھی دین کے لیے کچھ اور کرنے کی ضرورت باقی رہتی ہے، اس دوسرے میدان میں امت کے دوسرے موزوں افراد کو جدوجہد کرنی چاہیئے اور خود تبلیغ والوں کو اخلاص کی شرط کے ساتھ ان کی کوششوں کو تسلیم کرنا چاہیے اور انفرادی طور پر اس میں انہیں حصہ بھی لینا چاہیے۔ مثال کے طور پر بیسویں صدی کے نصف آخر میں ہم اس نوعیت کے جن مسائل سے دوچار ہیں ان میں سے چند یہ ہیں۔ مغربی افکار کے حملہ کے مقابلے میں علمی طور پر دین کی مدافعت، جدید دنیا میں مسلمانوں کو عزت و سربلندی کا مقام دلانے کی تدبیریں، جدید ضرورتوں کے مطابق اسلامی قانون کی تدوین، موجودہ حالات کے لحاظ سے مسلمانوں کا ایک نیا نظامِ تعلیم، جمہوریت اور سیکولرزم سے وقتی طور پر پیدا شدہ مسائل کا حل، جدید ذہن کے لحاظ سے اسلام پر دعوتی لٹریچر کی تیاری، وغیرہ۔

یہ دونوں کام کوئی ایک شخص یا گروہ انجام نہیں دے سکتا جو کچھ ممکن ہے وہ صرف یہ کہ دونوں ایک دوسرے کو تسلیم کریں، دونوں ایک دوسرے کے مشورے سے اپنے امور انجام دیں اور دونوں کم از کم انفرادی سطح پر، ایک دوسرے سے تعاون کو گوارا کرتے رہیں۔ بجلی پاور ہاؤس میں پیدا کی جاتی ہے اور مشینیں لوہے کے کارخانوں میں، مگر دونوں اس بنیاد پر کام کرتے ہیں کہ دونوں کو ایک جگہ ملنا ہے، اسی ملنے میں ساری برکت ہے اور اسی سے دونوں کی معنویت پوری طرح نمایاں ہوتی ہے اس قسم کا ذہنی اتحاد اگر امت کے اندر پیدا ہو جائے تو اس کے عظیم نتائج برآمد ہوں گے۔ حتیٰ کہ ہم دیکھیں گے کہ احیائے اسلام کا وہ خواب مہینوں اور سالوں میں واقعہ بن رہا ہے جس کا ہم صدیوں سے ناکام انتظار کر رہے ہیں۔ (۱۳۸۶ء)

خصوصیات

عبادت یا خلافت

سوال: آج کل مسلمانوں میں دو قسم کے مذہبی فکر چل رہے ہیں۔ ایک گروہ حکومت پر زور دیتا ہے، دوسرا گروہ عبادت پر۔ اس سلسلے میں آپ کا خیال کیا ہے۔

جواب: ہمارا خیال ہے کہ دونوں قسم کے گروہوں میں جو فرق ہے وہ دین اور بے دینی کا فرق نہیں ہے۔ بلکہ تصور دین یا تعبیر دین کا فرق ہے۔ وہ فرق ایک لفظ میں یہ ہے کہ ایک گروہ اپنے نصب العین کا تصور آیت خلافت سے اخذ کرتا ہے اور دوسرا گروہ آیتِ عبادت سے۔ ایک کے نزدیک اِنّی جاعل فی الارض خلیفۃ (اللہ نے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں) وہ قرآنی آیت ہے جس سے اسلام کا نصب العین معلوم ہوتا ہے۔ اس کے برعکس دوسرے کے نزدیک جس آیت سے اسلامی نصب العین اخذ ہوتا ہے وہ یہ آیت ہے:

وماخلقت الجنّ والانس الا لیعبدون میں نے جن وانس کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں

خلافتی فکر کے مطابق زمین خدا کی سلطنت کا ایک حصہ ہے اور اس حصہ پر اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا نائب سلطنت مقرر کیا ہے تاکہ وہ اس کے اوپر خدا کے قوانین کا نفاذ کرے۔ دوسری طرف عبادتی فکر کے سوچنے کا اندازہ یہ ہوتا ہے کہ انسان خدا کا عبد (بندہ) ہے۔ اس کے لئے اپنے رب کی رضامندی حاصل کرنے کا راستہ یہ ہے کہ وہ اس کی عبادت کرے، وہ اس کے آگے اپنے آپ کو بچھا دے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ خلافتی فکر رکھنے والے عبادت کو نہیں مانتے۔ یا عبادتی فکر رکھنے والوں کے یہاں "خلافت" کا کوئی مقام نہیں ہے۔ یہ فرق صرف اس معنی میں ہے کہ کوئی گروہ دینی تعلیمات کے مجموعہ کو کس رخ سے دیکھتا ہے۔ قرآن کو اگر کوئی شخص آیات قتال کے ذریعہ سمجھنا چاہے تو قرآن اس کو کتاب جنگ نظر آسکتا ہے۔ اس کے برعکس قرآن کو جو شخص آیات خشیت کی روشنی میں دیکھے، اس کو قرآن کتاب تقویٰ نظر آئے گا۔ ایسا ہی کچھ فرق مذکورہ دونوں گروہوں میں پایا جاتا ہے۔ خلافتی گروہ خلافت سے چل کر عبادت کو لیتا ہے۔ وہ عبادت کی معنویت کو اسی وقت سمجھ پاتا ہے جب کہ وہ اس کو حکومت وسیاست کے خانہ میں بٹھالے۔ اس کے برعکس دوسرا گروہ عبادت کی نگاہ سے خلافت کو سمجھنا چاہتا ہے۔ اس کے نزدیک عبادت بجائے خود مقصود ہے اور بقیہ تمام چیزیں اسی وقت بامعنی ہیں جبکہ وہ عبادت کے سرچشمہ سے نکلی ہوں۔

اس فرق کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ خود خلافت وعبادت کے تصور میں دونوں گروہوں کے درمیان فرق ہو جاتا ہے۔ خلافتی گروہ کے نزدیک حکومت اسلامی کا قیام دین کا مکمل ظہور ہے اور عبادت کی حیثیت یہ ہے کہ وہ حکومت اسلامی کے داعیوں یا کارکنوں کی تربیت واصلاح کا ذریعہ ہے۔ جب کہ عبادتی گروہ کا ذہن یہ ہے کہ اللہ کا حقیقی عبادت گزار بننا ہی مکمل مسلمان اور مکمل دین دار بننا ہے۔ جہاں تک خلافت یا حکومت کا تعلق ہے، اس کی حیثیت ایک دنیوی ذمہ داری کی ہے جو خاص حالات میں مسلمانوں سے مطلوب ہوتی ہے۔ نیز یہ ذمہ داری بھی، بہت سی دوسری شرعی ذمہ داریوں کی طرح، مشروط ذمہ داری ہے اور کبھی عائد ہوتی ہے اور کبھی عائد نہیں ہوتی۔

غیر مسلموں میں تبلیغ

مولانا محمد الیاس صاحبؒ کا ایک خط محفوظ ہے۔ موصوف نے یہ خط مولانا محمد علی جوہر کے نام لکھا تھا۔ یہ خط مولانا محمد علی کی روانگی لندن سے کچھ پہلے لکھا گیا تھا جس کے بعد ان کی ہندستان واپسی نہ ہو سکی۔ اس خط کے بعد دوبارہ مولانا الیاس صاحب اور مولانا محمد علی کی ملاقات نہیں ہوئی۔ یہ خط یہاں مکمل نقل کیا جا رہا ہے۔

مخدومی و مکرمی زید مکارمکم

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ،

آں مخدوم کی قابلیت اور ذکاوت اور قدرت علی الکلام و ہمدردی اسلام کا اس خاکسار کے دل پر نہ آج سے سکہ جمائے ہوئے ہے بلکہ کامریڈ کی تیز تابانی کے وقت سے جوہر شناس اور قدردان ہے۔ اور شیخ الکل یعنی سیدی و مولائی حضرت شیخ الہند کے زمانۂ نیازمندی اور آمد و رفت سامی کے برتاؤ نے اس خیال کو اور مضاعف اور مدلل کر دیا تھا ہمیشہ سے اس پرزور انجن کے اسلام کی کوئی بڑی گاڑی کھینچنے کی طبیعت متمنی اور جویا رہی۔

کچھ زمانہ سے خاکسار کے ذہن نارسا میں یہ مضمون آ رہا ہے کہ کوئی قابل اور اہل شخص خاص اور معتدل طریقہ سے فطری اور اوسط الملل مذہب یعنی اسلام کی طرف اس یورپین قوم کو زور و قوت اور پوری توجہ اور کوشش کے ساتھ دعوت الی الحق کرے تو اس کے لیے آپ کے سوا کسی پر نظر نہیں جمتی۔

اس وقت یہ قوم برسر اقتدار ہے اور ایک مدت سے حکمرانی کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عادت مع الخلق پر نظر کرتے ہوئے یہ بات خیال میں آتی ہے اہل حکومت لوگوں کو دعوت الی الحق کیے جانے پر مدعووین کی دو راہیں ہوتی ہیں۔ دعوت الی الحق کو قبول کر کے فوز دارین اور دین خداوندی اور مذہب آسمانی کی تر و تازگی اور آب و تابانی اور یا اس دین سے استنکاف اور اعراض کر کے استیصال و بربادی اور ہمیشہ کے لیے خسران و نامرادی۔ غرض کوئی سے ایک معاملہ کا ان کے ساتھ متعین ہو جانا اسی دعوت الی الحق کی قبولیت اور اعزاز اور رد و انکار پر مبنی ہے۔

اس مدعا کے لیے یہ پہلا خط لکھ رہا ہوں خدا کرے یہ تخم ایک بار آور شجر کا ہو اور اس مراسلت

کو مداومت بخشے اس کے واسطے پہلی بات اس طرز و طریق کا متعین کرنا ہے کہ جو اس کے لیے اختیار کیا جائے جس میں چند امور قابل لحاظ سمجھ میں آرہے ہیں۔

یہ کہ مناظرے اور صریح کسی پر چوٹ کرنے سے محفوظ ہو۔

دوسرے جو جو خرابیاں اپنے مذہب کی ان کے دلوں میں بیٹھی ہوتی ہیں ان کا شافی جواب لیے ہوئے ہوں اور اپنے مذہب کی اصولی چیزوں مثلاً حسن تعلیم وغیرہ کی خوبیوں پر روشنی ڈال رہی ہو۔ باوجود اس کے مختصر ہونے کے بنا پر عام اشاعت کے قابل ہو۔ مختصر چیز کی اشاعت آسان ہوتی ہے۔ غرضیکہ میں ایک نااہل شخص قابل و بیگانہ زمانہ کو کیا متوجہ کروں کہ کن کن امور کی رعایت ضروری ہے۔ آپ خود مجھ سے اچھا سمجھ سکتے ہیں۔

خلاصہ مطلب یہ ہے کہ اس کے مالہٗ و ماعلیہ پر کافی نظر کر کے کوئی طریق اولیٰ متعین کر لیا جاوے اور پھر خدائے پاک وحدہٗ لاشریک لہٗ کی نصرتِ قطعیہ کا یقین کر کے خدائے پاک پر بھروسہ کرتے ہوئے جناب محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ کی سرخروئی اور آخرت کا بہترین ذخیرہ سمجھتے ہوئے اس کام کو تندہی سے شروع کر دیا جائے پھر حق تعالےٰ اپنے وعدے کے موافق (حقا علینا نصر المومنین۔ ان تنصر اللہ ینصرکم۔ کتب اللہ لاغلبن انا ورسلی انا لننصر رسلنا والذین آمنوا) کشتی کو کسی کنارے لگا ہی دیں گے۔ رائے سامی سے مطلع فرمائیں۔

والسلام بندہ محمد الیاس عفی عنہ بقلم احتشام غفرلہ

مولانا محمد یوسف صاحبؒ نے ۲۱ اپریل ۱۹۶۴ء کو میدان عرفات میں ایک تقریر کی تھی۔ اس تقریر کے آخر میں آپ نے فرمایا:

" پہلے اپنے قصوروں کی معافی مانگو۔ پھر آئندہ کی توفیق اور امت کے لیے زیادہ سے زیادہ قربانی دینے کو امت کی ہدایت کو اللہ سے مانگو۔ گرد و غبار نے امت کی محبت کی چنگاریوں کو دبا رکھا ہے۔ اللہ سے مانگو کہ وہ اس غبار کو ہٹائے اور اس چنگاری کو بڑھائے۔ کفار بھی امت دعوت ہیں۔ ان کے لیے بھی دعائیں کرنی ہیں۔ اگرچہ اپنے مسلمان بھائیوں کی بے دینی کی وجہ سے ہم ان میں اب تک دعوت کا کام شروع نہیں کر سکے۔ لیکن ہم پر ان کا بھی حق ہے۔ ان کی ہدایت کی بھی دعا کرو۔ ساتھ ساتھ وہ کفار جو شریر ہیں اور شرارت کے ناکے ہیں۔ جن کے دلوں پر اللہ نے مہر لگا دی ہے ان کی تباہی کی دعائیں بھی مانگو۔"

تبلیغ کی زبان

کسی تحریک کی خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ اپنی ایک زبان پیدا کرتی ہے۔ تبلیغی تحریک نے بھی اپنے کارکنوں کو ایک مخصوص زبان اور طرز ادا دیا جو اس طرح رائج ہوا کہ ہزاروں افراد کی زبان سے بے تکلف ادا ہونے لگا۔ مثلاً مسجد میں تبلیغی جماعت کا اجتماع ہو رہا ہے اس میں شرکت کی دعوت دینی ہے تو اس طرح کہیں گے۔" بھائی مسجد میں کچھ فکر کی بات ہو رہی ہے۔ آؤ وہاں چلیں" مولانا یوسف صاحب ایک مکتوب میں لکھتے ہیں ـــــ" جب محلوں کی مساجد میں ہفتوں کی دو گشتوں کے ذریعہ فی گھر ایک آدمی تین چلے کے لیے نکلنے کی آواز لگ رہی ہو گی۔ تعلیموں اور تسبیحات پر احباب جڑ رہے ہوں گے۔ ہر مسجد سے تین دن کے لیے جماعتیں نکالنے کی کوششیں ہو رہی ہوں گی تو شب جمعہ کا اجتماع صحیح نہج پر ہو گا اور کام کے بڑھنے کی صورتیں بنیں گی .... مشورے سے ایسے احباب سے عموماً دعوت دلوائی جائے جو محنت کے میدان میں ہوں اور جن کی طبیعت پر کام کے تقاضے غالب ہوں بہت ہی فکر و اہتمام سے تشکیلیں کی جائیں۔ اگر اوقات وصول نہ ہوں تو رات کو بھی محنت کی جائے۔ رو رو کر مانگا جائے ...... تمام انبیاء علیہم السلام اپنے اپنے زمانے میں کسی نہ کسی نقشہ کے مقابلہ پر آئے اور بتایا کہ کامیابی کا اس نقشہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔"

ایک اور مکتوب میں لکھتے ہیں" جزیرۂ عرب کو دین حیات کے لیے جان کھپانے کا مرکز قرار دے کر اس میں طریقہ جُہد کے سیکھنے سکھانے کا رواج ڈال کر ہر طرف دین حیات کے لیے ٹھوکریں کھانے کے لیے مقامی احباب کے ساتھ مل کر روانہ کرنے کا رُخ ڈالا جائے ..... تین تین چلہ کی حجم کر دعوت دیں ..... عز بار وکس میرس طبقات میں کام کا ضرور پھیر ڈالیں۔"

اپنے شہر یا بستی کے قریب دیہات میں کام کی فضا بنے اس کے لیے ہر مسجد سے تین یوم کے لیے جماعتیں پانچ پانچ کوس کے علاقے میں جائیں۔" ماہ رمضان کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:" کیا ہی اچھا ہو کہ اس مبارک زمانہ میں تین تین چلوں کے لیے تشکیل کر کے جماعتیں روانہ کی جائیں تاکہ ارکانِ اسلام کی حیات، والی محنت کا حساب اس ماہ میں قائم ہو۔ اور اس ماہ میں چلہ کے لیے نکلنے کی برکت سے زیادہ وقت کے لیے اللہ رب العزت کے راستہ میں رواج پڑ جائے۔"

یہ نمونہ کے چند ٹکڑے ہیں۔ اسی طرح جماعت نے ایک مستقل تبلیغی زبان پیدا کی جس کے اندر سادگی کے ساتھ گہرائی اور تحریکی شدت کے ساتھ مٹھاس کی عجیب و غریب آمیزش تھی۔

نکلی ہوئی جماعتیں

ایک ہپی دہلی کی سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔ جسم پر سادہ کھردرے کپڑے، گلے میں مالا، ہاتھ میں کڑا اور کندھے پر ایک چھوٹی ڈھولک۔ اس سے پوچھا گیا تو اس نے بتایا کہ وہ کناڈا کا رہنے والا ہے۔ اس نے مزید بتایا کہ کناڈا میں اس کے پاس ذاتی مکان، ذاتی کار، ایک اچھی بیوی اور عمدہ ملازمت تھی۔ اس کے بعد اس نے کہا: مگر یہاں میرا کوئی گھر نہیں۔ جہاں بھی نیند آتی ہے سوجاتا ہوں، چاہے وہ فٹ پاتھ کیوں نہ ہو۔ میرے پاس یہاں کوئی سواری نہیں۔ ملازمت نہیں۔ میری بیوی مجھ کو چھوڑ چکی ہے۔ "یہ جو بال اور داڑھی آپ بڑھی ہوئی دیکھ رہے ہیں، یہ صرف پچھلے چھ مہینہ کی پیداوار ہیں" یہ کہہ کر اس نے اپنے بیگ کے اندر سے اپنا پاسپورٹ نکالا۔ پاسپورٹ کی سابقہ تصویر میں وہ ایک خوبرو نوجوان دکھائی دے رہا تھا۔

"پھر آپ نے کناڈا جیسے ملک کو چھوڑ کر انڈیا کو کیوں پسند کیا"۔ اس کے جواب میں اس نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ رک رک کر یہ الفاظ کہے:

There I was comfortable physically.
Here I am comfortable spiritually.

وہاں مجھ کو جسمانی سکون تھا، یہاں مجھ کو روحانی سکون ہے۔ (الجمعیۃ ویکلی ۱۰ جولائی ۱۹۷۰)

تبلیغی جماعت مسلمانوں میں دینی بیداری کا کام نہایت کامیابی کے ساتھ کر رہی ہے۔ اس کی کامیابی کا خاص راز وہ "تدبیر" ہے جو اس سلسلے میں اس نے اختیار کی ہے۔ اس کی تدبیر یہ ہے کہ لوگوں کو ان کے ماحول سے نکال کر باہر لے جایا جائے۔ آدمی اپنے ماحول میں دنیوی مسائل میں مشغول رہتا ہے۔ اس کا ذہن دینی امور پر سوچنے کے لئے فارغ نہیں ہوتا۔ مگر جب وہ اپنے ماحول کو چھوڑ کر باہر کی دنیا میں آجاتا ہے تو اس وقت اس کا ذہن اس قابل ہوجاتا ہے کہ جو کچھ اس سے کہا جائے اس کو سنے اور پکڑے۔

مغرب کے یہ ہپی گویا غیر مسلموں میں سے اسی قسم کے نکلے ہوئے لوگ ہیں۔ یہ اپنے آپ نکلی ہوئی جماعتیں ہیں۔ ضرورت ہے کہ غیر مسلموں کی ان نکلی ہوئی جماعتوں کو دین سکھانے کے لئے اسی طرح استعمال کیا جائے جس طرح تبلیغی جماعت مسلمانوں کو باہر نکال کر انہیں دین سکھانے کی مہم چلا رہی ہے۔

قرآن کا کرشمہ

جنوری ۱۹۸۳ میں حیدر آباد میں فرقہ وارانہ فساد ہوا۔ اس کے بعد سی آر پی کے جوان آئے اور گھروں کی تلاشیاں اور گرفتاریاں شروع ہوگئیں۔ ہر طرف خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ مولانا اکبر الدین قاسمی (سلطان شاہی حیدر آباد) کا مکان عین فساد زدہ علاقہ میں تھا۔ ۹ جنوری کو وہ اپنے گھر میں تھے کہ باہر سے دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ دروازہ کھولا تو باہر سی آر پی کے بارہ جوان کھڑے ہوئے تھے۔ وہ گھر کے اندر گھس آئے اور ایک ایک چیز کو دیکھنا شروع کیا کہ کوئی ہتھیار تو نہیں ہے۔ کوئی فسادی لڑکا تو گھر میں چھپا ہوا نہیں ہے۔

مولانا اکبر الدین قاسمی کے ساتھ اس وقت گھر میں صرف چار خواتین تھیں۔ خواتین کو اندیشہ ہوا کہ اگر انھوں نے مولانا قاسمی کو گرفتار کر لیا تو گھر میں اس کے بعد کوئی مرد نہ رہے گا صرف عورتیں عورتیں رہ جائیں گی۔ سب کے دل تیزی سے دھڑک رہے تھے۔ تلاشی لینے والے سپاہی مختلف چیزوں کو دیکھتے ہوئے بالآخر ایک الماری پر پہنچے۔ وہاں ہاتھ ڈالا تو اس کے اندر ایک مجلد کتاب تھی۔

"کیا یہ قرآن ہے" انھوں نے پوچھا

"ہاں" صاحب خانہ نے جواب دیا۔

"کیا آپ قرآن پڑھتے ہیں" سی آر پی گروہ کے افسر نے دوبارہ سوال کیا۔

"یہی تو ہم لوگوں کا کام ہے" ہم تو مدرسہ کے لوگ ہیں۔ ہمارا یہی کام ہے کہ قرآن کو پڑھیں اور قرآن کو پڑھائیں"

اس کے بعد سی آر پی کے افسر کا رخ بالکل بدل گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا "یہاں سے چلو، یہاں کچھ نہیں ملے گا" اور پھر سب کے سب گھر سے نکل کر باہر چلے گئے

ایسا کیوں ہوا۔ اس کی وجہ بالکل سادہ ہے۔ مولانا اکبر الدین قاسمی پہلے سی آر پی والوں کے لئے "صاحب مکان" تھے مگر بعد کو وہ ان کی نظر میں "صاحب قرآن" بن گئے۔ یہی فرق ہے جس کی وجہ سے اولاً انھوں نے ان کے اوپر شبہہ کیا اور بعد کو انھیں صحیح و سالم چھوڑ کر واپس چلے گئے۔

تبلیغی مزاج

مارچ ۱۹۸۵ء میں راقم الحروف کو الجامعۃ الاسلامیہ کی دعوت پر مدینہ منورہ جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں کے دوران قیام میں مختلف اخبارات و رسائل کے نمائندوں نے انٹرویو لیے انہیں میں سے ایک الجزائر کے وہ نوجوان تھے جن کا نام عبدالقادر انصاری تھا۔

ان کی شرعی داڑھی اور ان کے چہرے پر اسلامی سادگی کے آثار نے مجھے کافی متاثر کیا تاہم اس سے زیادہ اثر انگیز ان کا وہ رویہ تھا جو انہوں نے انٹرویو کے درمیان اختیار کیا۔ عبدالقادر انصاری اخبار المدینہ کے نمائندہ تھے۔ انہوں نے ایک کاغذ پر بہت سے سوالات عربی میں لکھ رکھے تھے۔ میں نے ان کے اکثر سوالات کے جوابات دیے۔ اور کچھ اختلافی نوعیت کے سوالات کا جواب دینے سے معذرت ظاہر کی۔

خلاف معمول میں نے دیکھا کہ وہ میرے جوابات خاموشی سے سن لیتے ہیں۔ میرے جوابات کے بعد دوبارہ نئی نئی شق نکال کر بحث نہیں کرتے۔ میری ہر معذرت کو فوراً قبول کرکے آگے بڑھ جاتے ہیں مجھے ان کا یہ مزاج بہت پسند آیا۔ کیونکہ یہی دینی مزاج ہے۔ ایک صحابی روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ہم کو قیل وقال سے اور زیادہ سوالات کرنے سے منع فرمایا۔
(نہانا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن کثرۃ السوال وعن کثرۃ القیل والقال)

عبدالقادر جزائری کے اس مزاج کا راز ان کی تبلیغی جماعت سے وابستگی ہے وہ تبلیغی جماعت سے متاثر ہیں۔ اور کسی جماعت کے ساتھ نظام الدین (دہلی) بھی جا چکے ہیں۔

مجھے ملاقاتوں کے دوران بار بار یہ تجربہ ہوا کہ تبلیغی جماعت کے افراد بحث و تکرار میں نہیں اُلجھتے۔ وہ اختلافی امور میں شدید نہیں ہوتے۔ یہ ان کے دینی مزاج کا ثبوت ہے۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو اسلام کی سیاسی تعبیرات سے متاثر ہیں۔ ان سے گفتگو کیجیے تو ایسا محسوس ہوتا ہے گویا انہوں نے نزاع برپا کرنے کا نام دین سمجھ لیا ہے۔ ان کو سب سے زیادہ دلچسپی اختلافی امور سے ہوتی ہے۔ کوئی بھی جواب انہیں چُپ نہیں کرتا۔ ہر جواب کے بعد وہ ایک نیا لفظی شوشہ نکال لیتے ہیں تاکہ اپنی اختلافی بحث کو جاری رکھ سکیں۔

کام کا طریقہ

تبلیغ میں یہ طریقہ ہے کہ افراد کو جماعت کی صورت میں تشکیل دے کر باہر نکالا جاتا ہے۔ مقامی طور پر محلہ وار گشت کے لیے یا بیرونی علاقوں میں تبلیغ اور تربیت کے لیے۔

ان افراد کو جن باتوں کی تلقین کی جاتی ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ جب بھی بولنے کی ضرورت ہو تو ہمیشہ ایک آدمی بولے۔ سارے لوگ بولنے نہ لگیں۔ تاہم اس کا مطلب سادہ طور پر صرف یہ نہیں ہے کہ ایک آدمی بولے اور باقی تمام لوگ خاموش اور بے کار رہیں۔ نہیں۔ ان چُپ رہنے والوں کو بھی تبلیغ ایک کام دیتی ہے، یہ کہ وہ خاموشی کے ساتھ دعاؤں میں مشغول ہو جائیں۔ وہ دل ہی دل میں متکلّم یا مقرر کے لیے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ اس کی زبان میں قوت دے اور اس سے وہ بات کہلائے جو اس کی مرضی ہو کہ کہا جائے۔

یہ عین اسلامی طریقہ ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے زمانہ میں یہی طریقہ تھا کہ ایک اہل شخص بولتا تھا اور بقیہ حاضرین اس کے حق میں دعا کرتے تھے۔ جب تک یہ نظام رہا، امّت کا معاملہ درست رہا۔ جب سارے لوگ بولنے لگے تو امت کا معاملہ بگڑ گیا۔

تبلیغ کی یہ روح اس سے متاثر ہونے والے افراد میں ہر معاملہ میں ظاہر ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تھا۔ صبح ۸ بجے کا وقت تھا۔ میں نے دیکھا کہ جوق در جوق طلبہ مسجد میں آ رہے ہیں۔ میں نے معلوم کیا تو پتہ چلا کہ وہ صلوٰۃ الحاجہ پڑھنے کے لیے آ رہے ہیں۔ یہ امتحان کا زمانہ تھا۔ یہ طلبہ امتحان میں جانے سے پہلے مسجد میں آ رہے تھے تاکہ دو رکعت صلوٰۃ الحاجہ پڑھ کر دعا کریں اور پھر امتحان دینے کے لیے امتحان ہال میں جائیں۔

مومن کا طریقہ یہ ہے کہ وہ ہر معاملے میں دوسروں کی طرف دیکھنے کے بجائے خدا کی طرف دیکھتا ہے۔ وہ اپنے آپ پر بھروسہ کرنے کے بجائے خدا پر بھروسہ کرتا ہے۔ لوگ بولنے کو کام سمجھتے ہیں۔ مومن وہ ہے جو نہ بولنے کو بھی کام سمجھے۔ لوگ اپنے قوّتِ بازو پر اعتماد کرتے ہیں، مومن وہ ہے جو خدا کے بازو کو اس طرح دیکھے کہ اپنا بازو اس کو یاد نہ رہے۔

سادگی کی اہمیت

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی یادیں Lord Mountbatten Remembers کے نام سے بی بی سی نے ایک ڈکومنٹری فلم پیش کی ہے۔ اس میں بہت سے دلچسپ واقعات ہیں۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بتایا کہ برطانیہ کی ملکہ الزبتھ کی شادی جب پرنس فلپ سے ہوئی تو گاندھی جی نے ملکہ الزبتھ کو اس موقع پر ایک تحفہ بھیجا تھا۔ یہ ایک میز پوش تھا جو گاندھی جی کے اپنے ہاتھ سے کاتے ہوئے سوت سے تیار کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بھدی چٹائی کی مانند تھا۔ تاہم ملکہ برطانیہ نے اس کو قبول کر لیا۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کہتے ہیں کہ کچھ سال بعد انھوں نے برٹش میوزیم میں گاندھی جی کی یادگاری اشیاء کی نمائش کی تو تلاش کے باوجود ان کو مذکورہ چٹائی نہ مل سکی۔ انھوں نے سوچا کہ شاید حفاظت کے خیال سے اس کو ٹاور آف لندن میں بھیج دیا گیا ہو۔ مگر وہاں بھی اس کا سراغ نہ مل سکا۔ آخر اس کا ذکر ملکہ الزبتھ سے ہوا۔ ملکہ نے اپنا ایک خاص ڈراز کھول کر وہ چٹائی نکالی اور اس کو دیتے ہوئے کہا: آپ نے مجھ سے کیوں نہیں کہا۔ میں نے تو اس کو اپنے پاس حفاظت سے رکھ لیا تھا تاکہ کسی کا ہاتھ اس کو لگنے نہ پائے (ٹائمس آف انڈیا ۱۱ نومبر ۱۹۸۰)

Oh, why did'nt you ask me, I let nobody else touch that. I keep that myself.

ملکہ برطانیہ نے کھدر کی ایک بھدی چٹائی کو محفوظ رکھنے کا اتنا اہتمام کیوں کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کے "بھدے پن" میں ان کو تقدس کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔

تبلیغی جماعت کے کچھ لوگ لندن گئے۔ وہ اپنے لمبے کرتے، اونچے پائجامہ اور گول ٹوپی میں بظاہر وہاں عجیب سے معلوم ہوتے تھے۔ مگر اس کے باوجود انگریز ان کا بہت ادب کرتے تھے۔ ایک بار ان لوگوں نے کسی پارک میں نماز پڑھی۔ وہ نماز پڑھ کر بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک انگریز آیا اور ان کی پیٹھ پر اپنے دونوں ہاتھ پھیر کر اپنے ہاتھوں کو چوم لیا۔ ایک شخص نے پوچھا: تم ان لوگوں کا اتنا احترام کیوں کرتے ہو۔ اس نے جواب دیا: یہ لوگ اپنے اس حلیہ میں ہم کو عیسیٰ اور موسیٰ کی طرح دکھائی دیتے ہیں:

They are just like Jesus and Moses.

فیشن اور ٹیپ ٹاپ میں اگر شان کا پہلو ہے تو سادگی میں اس سے بھی زیادہ بڑا ایک پہلو ہے اور وہ تقدس ہے۔ سادگی اگر روحانیت کے ساتھ ہو تو وہ دیکھنے والوں کے لئے مقدس چیز بن جاتی ہے اور لوگوں کے حق میں رواجی اہتمام سے زیادہ مؤثر ثابت ہوتی ہے۔ فیشن اور میک اپ کے متعلق ہر آدمی جانتا ہے کہ یہ بازار سے خریدی ہوئی چیزیں ہیں اس لئے ان کو دیکھ کر کسی کے اوپر غیر معمولی تاثر قائم نہیں ہوتا۔ مگر سادگی کے انداز میں تقدس کا جو پہلو ہے اس کی وجہ سے سادگی کو دیکھ کر فوراً احترام کا جذبہ ابھر آتا ہے، جو یقیناً پہلے جذبہ سے کہیں زیادہ اہم ہے۔

دوست کی خاطر

اگر آپ کسی سفر پر جانے کے لئے ہوائی اڈہ پہنچیں اور وہاں اپنے دوستوں سے ملنے میں بہت زیادہ دیر لگا دیں تو ہو سکتا ہے کہ آپ اپنی پرواز کھودیں۔ آپ ملاقات کی سیٹ پر لمبی بات چیت میں مشغول ہوں اور ہوائی جہاز کی روانگی کا وقت آجائے اور وہ آپ کو لئے بغیر اڑ جائے۔ لیکن اگر آپ کا "دوست" ملک کا حکمراں ہو تو صورت حال بالکل بدل جاتی ہے۔

ہندستان کی حکمراں پارٹی کے دو ممبران پارلی منٹ مسٹر ارن نہرو اور مسٹر اودے سنگھ راؤ گائیکواڑ کیوبا گئے۔ وہاں ان کو کیوبا کی سالانہ تقریبات میں شرکت کرنا تھا۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۹ اگست ۱۹۸۳) کی رپورٹ کے مطابق تقریبات کی تکمیل کے بعد انھوں نے چاہا کہ کیوبا کے صدر ڈاکٹر فیڈل کیسٹرو (Dr. Fidel Castro) سے ملاقات کریں۔ انھوں نے صدر کے دفتر میں اپنی درخواست بھجوائی۔ دو دن کے انتظار کے بعد انھیں جواب ملا کہ صدر نے آپ دونوں کو آج رات کے کھانے پر مدعو کیا ہے۔ مگر ایم پی صاحبان نے محسوس کیا کہ وہ صدر کی اس عنایت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ کیوں کہ اسی دن شام کو ۵ بجے ان کا واپسی کا رزرویشن تھا۔ انھوں نے صدر کے دفتر میں معذرت کا پیغام بھیج دیا اور اپنے پروگرام کے مطابق ہوائی اڈہ کے لئے روانہ ہو گئے۔

وہ لوگ ہوانا ایرپورٹ پر تھے کہ اچانک ڈاکٹر کیسٹرو برآمد ہوئے۔ وہ اپنے "انڈین فرینڈس" سے ملنے کے لئے ہوائی اڈہ پہنچے تھے۔ انھوں نے دونوں ہندستانی ایم پی سے پرجوش ملاقات کی اور وی آئی پی لاونج میں بیٹھ کر ان سے بے تکلف باتیں کرنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد ڈاکٹر کیسٹرو کے مترجم نے محسوس کیا کہ ایم پی صاحبان کے چہرے پر گھبراہٹ کے آثار ظاہر ہو رہے ہیں۔ پوچھنے پر انھوں نے بتایا کہ معزز صدر کی بات لمبی ہوتی جا رہی ہے اور گھڑی کے مطابق ہماری جہاز کی اڑان کا وقت ہو گیا ہے۔ مترجم نے مسکراتے ہوئے کہا کہ آپ مطمئن رہیں آپ کا جہاز اس وقت تک اڑان نہیں کرے گا جب تک ڈاکٹر کیسٹرو اس کو گرین سگنل نہ دے دیں:

Your plane will not take off until Dr. Castro gives the green signal.

ہوائی اڈہ کے ذمہ داروں کے علم میں اگر یہ بات آجائے کہ ملک کا حکمراں ہوائی اڈہ کے انتظارگاہ میں اپنے دوست مسافر سے بات کر رہا ہے تو وہ خود ہی ہوائی جہاز کو اس کے سوار ہونے تک روکے

رہیں گے۔ اس کے بعد حکمراں کو یہ ضرورت نہیں کہ وہ باقاعدہ طور پر اس کے لئے ہدایت نامہ جاری کرے۔

یہ معاملہ جس کا تجربہ ہندستان کے ایم پی صاحبان کو ایک ملک کے حکمراں کے بارے میں ہوا، یہی زیادہ بڑے پیمانے پر کائنات کے حکمراں کے بارے میں بھی صحیح ہے۔ اگر آپ مالک کائنات کے کام میں لگے ہوئے ہوں۔ اگر زمین و آسمان کے بادشاہ سے آپ کی ملاقات جاری ہو تو آپ کا معاملہ عام معاملہ نہیں رہتا بلکہ خاص معاملہ بن جاتا ہے۔ خدا میں مصروف ہونے کی وجہ سے جو کام آپ بطور خود نہ کر سکے وہ خدا کی دوسری مخلوقات آپ کی طرف سے انجام دے دیں گی۔ جہاں عام لوگوں کے کام بگڑتے ہیں وہاں آپ کے کام بن جائیں گے۔ جب لوگ مواقع کھو دیتے ہیں اس وقت مواقع خود انتظار کریں گے کہ آپ آئیں اور ان کو استعمال کریں۔

تبلیغی جماعت کے کچھ لوگ ٹرین میں سفر کر رہے تھے۔ درمیان میں نماز کا وقت آگیا۔ لوگوں کی رائے ہوئی کہ باقاعدہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کی جائے۔ چنانچہ اگلے اسٹیشن پر ٹرین کھڑی ہوئی تو پوری جماعت پلیٹ فارم پر اتر گئی۔ کسی نے کہا کہ یہاں ٹرین صرف دو منٹ رکتی ہے۔ آپ لوگ نماز پڑھتے رہیں گے اور گاڑی چلی جائے گی۔ قافلہ کے امیر نے کہا کہ ہم اللہ کا کام کرنے جا رہے ہیں اور گاڑی بھی اللہ کی ہے۔ پھر کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ ہم کو لئے بغیر آگے چلی جائے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ لوگوں نے پورے اطمینان کے ساتھ پلیٹ فارم پر باجماعت نماز ادا کی۔ گاڑی کے انجن نے صرف اس وقت سیٹی دی جب کہ وہ لوگ نماز سے فارغ ہو کر اپنے ڈبہ میں واپس آچکے تھے۔

ایک ملک کے صدر کے دوستوں کے لئے اگر ہوائی جہاز رک سکتا ہے تو ہمیں تعجب نہیں کرنا چاہئے اگر خدا کے دوستوں کی خاطر زمین و آسمان کی گردشیں رک جائیں۔ بشرطیکہ زمین پر یہ واقعہ رونما ہو کہ خدا کے کچھ بندے خدا کو اپنا دوست اور اپنا کارساز بنالیں۔

موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی بدقسمتی یہ ہے کہ انھوں نے اپنے کیس کو خدا کا کیس نہیں بنایا۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں قومی جذبات کے تحت کر رہے ہیں نہ کہ ربّانی جذبات کے تحت۔ ان کی تحریکیں اور ان کے لیڈروں کی سرگرمیاں بتاتی ہیں کہ ان کا کیس ابھی تک صرف مادی مفادات اور قومی مسائل کا کیس ہے۔ وہ خدا کے لئے نہیں بلکہ غیر خدا کے لئے سرگرم ہیں۔ ایسی حالت میں یہی ہو سکتا ہے کہ وہ قوموں سے بچھڑ جائیں۔ ان کا "جہاز" ان کو ساتھ لئے بغیر اڑ جائے۔

ایک شہر دو کہانی

ستمبر ۱۹۸۲ میں ملک کے ایک شہر میں فساد ہوا۔ جانیں ضائع ہوئیں۔ دکان اور مکان جلا دئے گئے۔ تجارتوں اور صنعتوں کو تقریباً ایک ارب روپے کا نقصان پہنچا۔ اور ان تمام نقصانات میں ۹۰ فی صد سے زیادہ حصہ مسلمانوں کا تھا۔

مگر اسی شہر میں ایک مدرسہ ہر قسم کے نقصان سے بالکل محفوظ رہا۔ ایک ہی شہر میں دو قسم کے انجام کا راز صرف یہ تھا کہ شہر کے بقیہ مسلمانوں نے مقابلہ آرائی کی پالیسی پر عمل کیا اور مدرسہ والوں نے صبر کی پالیسی پر۔

یہ مدرسہ "دشمنوں" کے علاقہ میں تھا۔ وہ ہر طرف سے دشمنوں سے گھرا ہوا تھا۔ عین اس وقت جب کہ سارے شہر میں قیامت برپا تھی، ۱۱ ستمبر ۱۹۸۲ء کی رات کو دس بجے تقریباً پانچ سو آدمیوں کا غول آیا اور مدرسہ کو گھیر لیا۔ وہ لوگ نعرے لگا رہے تھے ——— مدرسہ میں آگ لگا دو، ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑو وغیرہ۔ مدرسہ کے پاس ایک میدان میں کنکر پتھر کافی پڑے ہوئے تھے۔ یہاں سے اٹھا اٹھا کر ان لوگوں نے مدرسہ میں پتھر پھینکنے شروع کئے۔ ۸۔۱۰ آدمی مدرسہ کی چھت پر چڑھ گئے اور اوپر سے چیخنا شروع کیا۔

اس حالت میں مدرسہ والوں نے کیا کیا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ فسادیوں کا غول ان کی طرف آرہا ہے تو پہلے سے سوچے ہوئے منصوبہ کے مطابق انھوں نے تمام روشنیاں بجھا دیں۔ حالات کے تحت انھیں قطعی اندیشہ تھا کہ فسادی ان کے اوپر حملہ کرنے آئیں گے۔ انھوں نے باہم مشورہ سے طے کیا تھا کہ جب ایسا ہوگا تو ہم مدرسہ میں بالکل اندھیرا کر دیں گے اور کمروں میں داخل ہو کر یہ آیت پڑھنا شروع کریں گے: لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ۔ ہم اس وقت تک کوئی جوابی کارروائی نہ کریں گے جب تک وہ بالکل ہمارے پاس نہ آجائیں۔

فسادیوں کا غول پتھر پھینک رہا تھا اور نعرے لگا رہا تھا اور مدرسہ کے تمام لوگ روشنیاں بجھا کر اپنے کمروں میں آیت قرآنی کا ورد کر رہے تھے۔ شہر کے عام مسلمانوں کے برعکس مدرسہ والوں کی اس خاموشی نے فسادیوں پر رعب ڈال دیا۔ انھوں نے سمجھا کہ یہ کوئی گہری سازش ہے اور انھوں نے کوئی خاص تیاری کر رکھی ہے جس کو وہ اس وقت سامنے لائیں گے جب کہ ہم لوگ اندر داخل ہو جائیں گے۔ چنانچہ مجمع کی طرف سے کچھ لوگوں نے پکار کر کہنا شروع کیا "واپس چلو، آگے نہ بڑھو، ورنہ تم میں سے کوئی بچ کر نہیں جائے گا"۔ اس کے بعد چھت پر چڑھنے والے نیچے اتر آئے اور سارے کے سارے فسادی جدھر سے آئے تھے ادھر ہی واپس چلے گئے۔

ثواب کی طاقت

راقم الحروف تبلیغی جماعت کے مرکز (نظام الدین) کے پڑوس میں رہتا ہے۔ ۷ جولائی ۱۹۸۴ کو اس علاقہ کے ہیڈ پوسٹ مین، مسٹر ہردت سنگھ سے ملاقات ہوئی۔ بات چیت کے دوران انھوں نے بتایا کہ تبلیغی مرکز میں روزانہ جو منی آرڈر آتے ہیں اس کے لئے ایک خاص آدمی مقرر ہے۔ ان کے یہاں منی آرڈروں کے اندراج کا انتظام پوسٹ آفس سے بھی زیادہ مکمل ہے۔ ہم کو کبھی کسی منی آرڈر کے سلسلہ میں جانچ کرنی ہوتی ہے تو ہم ان کے رجسٹر سے اپنا حساب صحیح کر لیتے ہیں۔

تبلیغی جماعت کے مرکز (نظام الدین) میں آپ فجر کی نماز پڑھیں۔ آپ دیکھیں گے کہ جیسے ہی امام نے نماز ختم کی، چند آدمی اپنی جگہ سے اٹھ کر متحرک ہو گئے ہیں۔ وہ کرسی اور لاؤڈ اسپیکر لا کر مسجد کے وسط میں رکھ رہے ہیں۔ ایسا اچانک نہیں ہوتا۔ یہ افراد پہلے سے اسی کام کے لئے نامزد ہوتے ہیں کہ وہ نماز کے بعد مقرر کی تقریر کا انتظام کریں۔ چنانچہ نماز کے فوراً بعد وہ مقرر کو بٹھانے اور لوگوں تک اس کی آواز پہنچانے کے بندوبست میں لگ جاتے ہیں۔

تبلیغی جماعت بظاہر ایک "مذہبی" جماعت ہے۔ مگر اس کے مرکز میں روز و شب کا جو نظام ہے وہ کسی اعلیٰ ترین دفتر سے کسی طرح کم نہیں۔ چنانچہ مرکز میں نظم و نسق کے لئے دس سے بھی زیادہ الگ الگ جماعتیں مقرر ہیں۔ ہر جماعت کا ایک مخصوص کام ہے جس میں وہ لگی رہتی ہے مثلاً ایک جماعت نگرانی کے لئے، دوسری جماعت صفائی کے لئے، تیسری جماعت لوگوں کو نماز کے وقت اٹھانے کے لئے۔ چوتھی جماعت استقبال کے لئے، پانچویں جماعت کھلانے پلانے کے لئے۔ چھٹی جماعت لوگوں کے منی آرڈروں کی وصولی اور تقسیم کے لئے۔ وغیرہ وغیرہ

یہ جماعتیں رات دن اپنے اپنے کاموں میں سرگرم رہتی ہیں۔ ہر جماعت کے لئے باریاں مقرر ہیں۔ ایک باری کا وقت پورا ہونے پر فوراً دوسری جماعت آتی ہے اور کام کو سنبھال لیتی ہے۔ طریقہ یہ ہے کہ اجتماع میں اعلان کر دیا جاتا ہے کہ فلاں کام کے لئے اتنے آدمی درکار ہیں، لوگ اپنا نام بتا دیں۔ چنانچہ لوگ خود پیشکش کرتے ہیں اور اس کے مطابق جماعتیں بنا لی جاتی ہیں۔ یہ نظام اسی طرح پورے سال چلتا ہے۔ شہد کے چھتہ میں قدرت کا جو اجتماعی نظام ہے اس کا انسانی نمونہ دیکھنا ہو تو "بنگلہ والی مسجد" میں چند دن گزار کر دیکھئے۔ قدرت کے نمونے کی پوری نقل آپ یہاں

پائیں گے۔

ہر جماعت کو تربیت دے کر اس کے مخصوص کام کے لئے تیار کیا جاتا ہے تاکہ وہ نہ صرف اپنی ڈیوٹی کو ٹھیک ٹھیک انجام دے بلکہ اسی کے ساتھ اس سے متعلق دینی تقاضے کو بھی پورا کرے۔

مثلاً مرکز تبلیغ میں کثرت سے بیت الخلاء اور طہارت خانے بنے ہوئے ہیں۔ اس بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ غیر متعلق قسم کے لوگ محض اپنی حاجت پوری کرنے کے لئے یہاں آجاتے ہیں۔ چنانچہ اس شعبہ کے نگراں کو سکھایا جاتا ہے کہ جب ایسا کوئی آدمی آپ مرکز کے اندر دیکھیں تو اس سے کہیں کہ بھائی یہ مسجد ہے مسجد کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں اس لئے جب آپ یہاں آئے ہیں تو دیکھئے یہ پانی کا حوض ہے۔ آپ وضو کر کے دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھ لیجئے۔ اسی طرح اس کو سکھایا جاتا ہے کہ مرکز کے اندر تعلیم ہو رہی ہو تو کوشش کیجئے کہ آنے والا آدمی وہاں بیٹھ کر کچھ دین کی باتیں بھی سن لے۔

تبلیغی مرکز میں یہ سارا کام بالکل رضا کارانہ ہوتا ہے۔ یعنی کسی کی کوئی تنخواہ یا اجرت مقرر نہیں۔ اس کے باوجود کیوں یہ لوگ اتنی سرگرمی اور ذمہ داری کے ساتھ اپنا کام انجام دیتے ہیں۔ اس کا جواب صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ثواب کے لئے۔ آجکل عام اداروں میں تنخواہ اور اجرت کے باوجود جو ابتری پائی جاتی ہے اس سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے تو یہ کہنا صحیح ہوگا کہ "ثواب" میں تنخواہ سے زیادہ طاقت پائی جاتی ہے۔ ثواب اگرچہ ایک خالص اخروی چیز ہے لیکن مذکورہ مثال بتا رہی ہے کہ اس کے اندر انتظامی قدر بھی پوری طرح موجود ہے۔

رمضان ۱۴۰۴ھ میں تقریباً ۴۰۰ آدمی تبلیغی مرکز میں مقیم تھے۔ ۱۸ رمضان المبارک کا واقعہ ہے حضرت جی (مولانا انعام الحسن صاحب) حسب معمول معائنہ کے لئے نکلے۔ مسجد، مدرسہ، مطبخ وغیرہ ایک ایک چیز انھوں نے بنفس نفیس دیکھی۔ اسی اثنا میں وہ مطبخ میں پہنچے جو مسجد کے پیچھے واقع ہے۔ وہاں دو بظاہر اجنبی آدمی دکھائی دئے۔

حضرت جی ننگے پاؤں ایک ایک مقام کو دیکھ رہے تھے۔ جہاں کہیں صفائی یا نظم و ترتیب کے خلاف کوئی چیز دیکھتے تو اس کی درستگی کی ہدایت کرتے۔ اسی حالت میں وہ مطبخ میں پہنچے۔ وہاں ایک جگہ کوڑا پڑا ہوا نظر آیا تو ہدایت کی کہ اس کی فوراً صفائی کرو، اس سے مکھی مچھر پیدا ہوتے ہیں۔

اس وقت جو صاحب مطبخ کی نگرانی پر تھے وہ اتفاق سے موجود نہ تھے۔ چند منٹ میں وہ آگئے تو حضرت جی نے نرمی سے کہا "میرے بھائی، آپ کہاں تھے"۔ اتنے میں دو آدمی مطبخ کے اندر داخل ہوتے

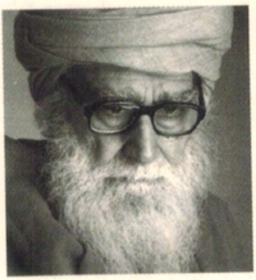
ہوئے نظر آئے۔ وہ بظاہر اجنبی تھے۔ نگراں صاحب ان کے پاس گئے اور انھیں باہر رخصت کرکے دوبارہ حضرت جی کے پاس آئے۔ حضرت جی نے پوچھا کہ وہ کون تھے۔ نگراں صاحب نے بتایا کہ وہ لوگ درگاہ نظام الدین کی زیارت کے لئے آئے تھے۔ یہاں غلطی سے داخل ہوگئے۔

"پھر آپ نے ان سے کیا کہا" حضرت جی نے دوبارہ پوچھا۔ انھوں نے بتایا کہ میں نے کہا کہ یہ درگاہ نہیں ہے۔ آپ اور آگے جائیں۔ وہاں آپ کو درگاہ مل جائے گی۔ حضرت جی (مولانا انعام الحسن صاحب) نے فوراً کہا "میرے بھائی، آپ نے ایک موقع کھو دیا" "آپ کو اپنی دعوت ان کے سامنے پیش کرنا چاہئے تھا۔ ممکن ہے کہ وہ لوگ ہمارے دینی نظام میں شریک ہو جاتے اور پھر ان کو نفع حاصل ہوتا"

دعوتی ذہن اور ثواب کا مزاج سب سے اعلیٰ ذہن اور مزاج ہے۔ جن لوگوں کے اندر یہ صفت پیدا ہو جائے ان کے اندر دوسری صفتیں اپنے آپ پیدا ہو جاتی ہیں۔ دعوت کا ذہن انھیں مجبور کرتا ہے کہ وہ دوسروں کے خیر خواہ بنیں۔ اور ثواب کا ذہن یہ مزاج پیدا کرتا ہے کہ وہ انعام سے بے پروا ہو کر اپنی ڈیوٹی انجام دیتے رہیں۔ اور یقیناً ان دونوں چیزوں سے زیادہ قیمتی کوئی چیز اس دنیا میں نہیں۔

تبلیغی تحریک

تحریکیں عام طور پر دو طرح کی ہوتی ہیں — ایک وہ جو نظام کی بنیاد پر اٹھتی ہیں۔ دوسری وہ جو انسان کی بنیاد پر اٹھتی ہیں۔ ایک کا نشانہ اجتماع ہوتا ہے، اور دوسری کا نشانہ فرد۔ تبلیغی تحریک وہ تحریک ہے جس کا نشانہ فرد ہے۔ ایک انسان کو اس کے رب سے جوڑنا۔ ایک انسان کو آخرت میں کامیاب انجام کے قابل بنانا، اصولی طور پر یہی اِس تحریک کا بنیادی مقصد ہے۔



www.goodwordbooks.com
ISBN 978-81-7898-841-2
9 788178 988412
₹ 40
Goodword